فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ
مجلّہ
کاروان
2023-24
غالب نمبر
گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج
جلالپور جٹاں ضلع گجرات

بسم الله الرحمن الرحيم

علمی و ادبی مجلّہ

کارواں

غالب نمبر: 2023-24

سرپرست:

کلیم احسان بٹ پرنسپل

مدیرِ اعلیٰ محمود احمد اسسٹنٹ پروفیسر جرنلزم

مدیر سکندر علی لیکچرار اُردو

طالب علم مدیر رضا الحسن، اسد اللہ، ولید حسن

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج

جلالپور جٹاں ضلع گجرات

053-3592356 gahcjpj@gmail.com

کلیم احسان بٹ
پرنسپل

اسسٹنٹ پروفیسر
محمود احمد
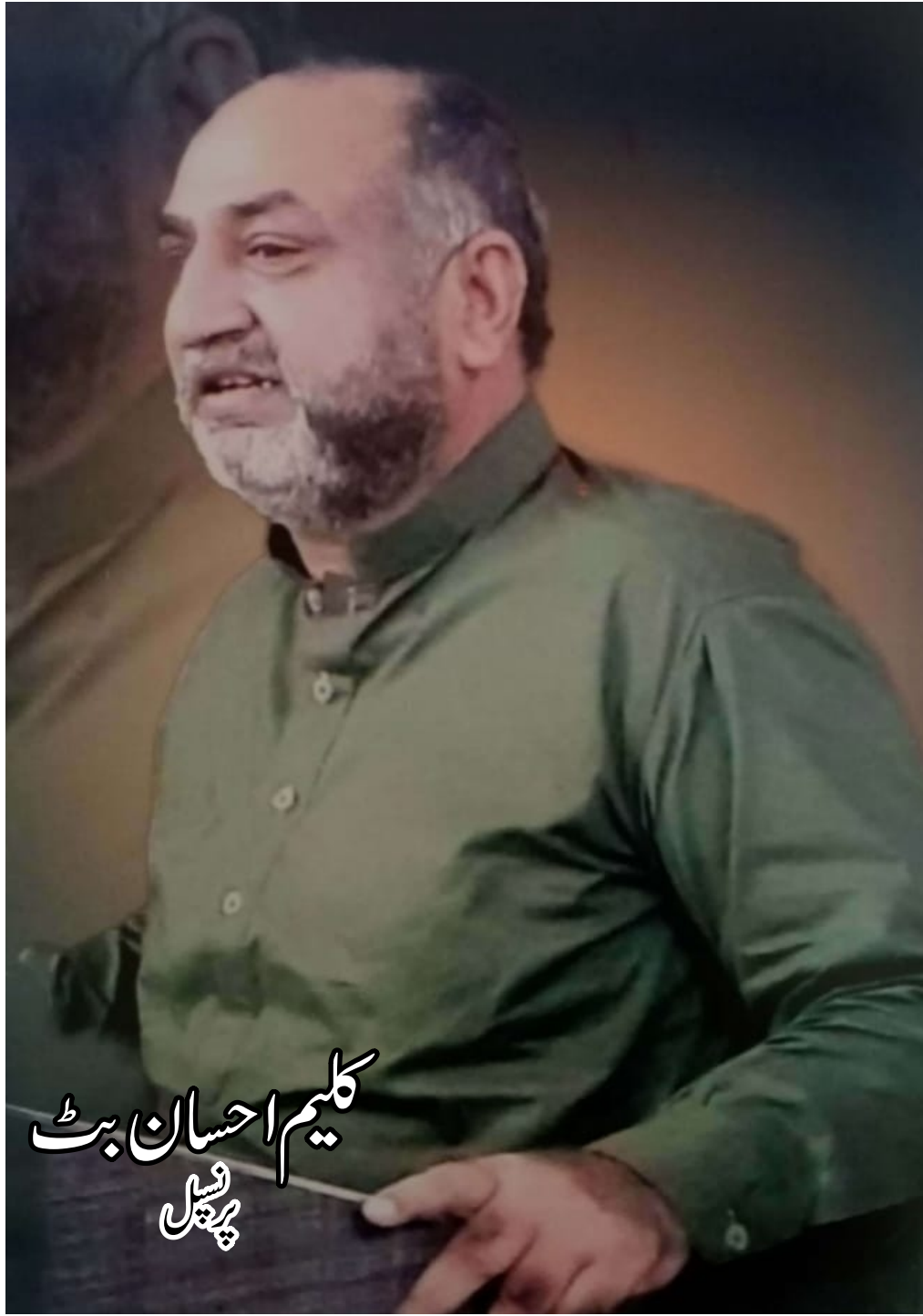
سکندر علی
لیکچرار اُردو

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ کالج کے پرنسپل صاحبان
پروفیسر صادق پرویز ساہی
پروفیسر چوہدری ریاست علی
پروفیسر وقار حسین طاہر
پروفیسر حامد حسین سید
پروفیسر محمد احسان اللہ خان
پروفیسر قاضی حبیب الرحمان
پروفیسر کلیم احسان بٹ
پروفیسر عبدالاسلام چوہدری
پروفیسر مفتی عبدالعزیز
پروفیسر سید شجاعت حسین شاہ
پروفیسر ایم عارف چوہدری
پروفیسر شاہد احمد چوہدری
پروفیسر چوہدری محمد احسن

تقریب رونمائی کتاب ''اساتذہ، بیوروکریسی اور سیاستدان'' مصنف جاوید احمد ملک

ڈاکٹر محمد کلیم ڈپٹی سیکرٹری حکومت پنجاب تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

کاشف منظور ڈپٹی سیکرٹری / چیف سیکرٹری پنجاب کتاب پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے

صاحب کتاب جاوید احمد ملک کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے

جاوید احمد ملک، پرنسپل کلیم احسان بٹ کو کتاب پیش کرتے ہوئے

محمود احمد، اسسٹنٹ پروفیسر جرنلزم کتاب پر مضمون پڑھتے ہوئے

حاضرین ظہرانہ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

میڈم ثمرہ اکرم نظامت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے

حاضرین صاحب کتاب کے ساتھ گروپ فوٹو میں

معزز مہمانان گرامی کالج کیمپس کا دورہ کرتے ہوئے

حاضرین صاحب کتاب کے ساتھ گروپ فوٹو میں

پروفیسر صدیق ناصح، قاری عابد حسین

کالج میں لٹریری فیسٹیول اور کتاب میلہ میں ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم کی شرکت

کالج میں لٹریری فیسٹیول اور کتاب میلہ کی تقریبات

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ کالج جلال پور جٹاں میں کتب میلے کا انعقاد

جلال پور جٹاں میں پہلا لٹریری فیسٹیول اور کتاب میلہ!

جناب ڈاکٹر زاہد ظہیر اور جناب میر مشتاق
فیروز شاہ حسین شاہ کمپیوٹر لیب کا افتتاح کرتے ہوئے

ڈاکٹر جاوید احمد ملک کی کتاب اساتذہ بیوروکریسی
اور سیاستدان کی تقریب رونمائی کے موقع پر

یوم اقبال کے موقع پر اقبال اکادمی لاہور سے تشریف لائے
ہوئے مہمان طلباء کو انعامات دے رہے ہیں

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں
کھیلوں کی سرگرمیاں

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں
کتابوں کی نمائش

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں
کھیلوں کی سرگرمیاں

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج کی 50 ویں سالگرہ کے موقع
پر ڈائریکٹر ایجوکیشن گوجرانوالہ جناب ڈاکٹر پروفیسر سید مختار حسین شاہ

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں
جشن بہاراں کے موقع پر پھولوں کی نمائش کا افتتاح

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں
شجر کاری کے بعد دعائے خیر

گولڈن جوبلی

دائیں سے بائیں: پرنسپل کلیم احسان بٹ، پروفیسر محمد شوکت، سید تقویم الحسن، جنید احمد جویہ، راشد محمود انوری اور طاہر اکرام راٹھور

ڈاکٹر زاہد ظہیر و پرنسپل کلیم احسان بٹ مہمانوں کے ہمراہ گولڈن جوبلی کیک کاٹتے ہوئے

شرکائے تقریب کا ایک انداز

پروفیسر ساجد شاہین اور وائس پرنسپل سید شجاعت ہاشمی کا دورانِ تقریب ایک انداز

جناب شیخ صدیق ظفر، پرنسپل کلیم احسان بٹ، پروفیسر عارف چوہدری، پروفیسر ڈاکٹر سید ممتاز حسین (ڈائریکٹر کالجز)، تنویر احمد جوئیہ، پروفیسر شمیم اختر (ڈپٹی ڈائریکٹر) اور دیگر مہمانانِ گرامی تقریب کا کیک کاٹتے ہوئے

پروفیسر راشد اللہ بٹ اور پروفیسر سید وقار افضل تقریب میں شریک

حاضرینِ محفل تقریب کے بعد طعام سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

دائیں سے بائیں پروفیسر صاحبان: محمد حزل، اویس عارف، علی فاروق میر، اسرار اصغر، محمود احمد، ڈاکٹر سمیع اللہ، شمس سلیمان ارشد اور سید رمیض جعفری

گولڈن جوبلی

تقریب کا ایک منظر

پروفیسر حکیم سید صابر علی شاہ اپنی یادیں بیان کرتے ہوئے

پروفیسر ڈاکٹر طارق کلیم (صدر پروفیسرز اینڈ لیکچررز ایسوسی ایشن پنجاب) پرنسپل صاحب کے ہمراہ

پروفیسر ڈاکٹر سید مختار حسین شاہ، پروفیسر سلیم سید، پروفیسر حافظ محمد بشیر، منیر جوئیہ ایڈووکیٹ، پروفیسر شفقت اللہ شاد اور جناب کاشف منظور تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

شیخ عبدالرشید اور سید عقیل عباس تقریب میں موجود

پرنسپل کلیم احسان بٹ معزز مہمانوں کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: پروفیسر صاحبان محمد شوکت، اویس عارف، حافظ محمد بشیر، پرنسپل کلیم احسان بٹ
وائس پرنسپل سید شجاعت ہاشمی، نذیر شریف اور تنویر ارشد

یوم اقبال

دائیں سے بائیں: فہیم ارشد اسسٹنٹ ڈائریکٹر (IT) اقبال اکیڈمی، پروفیسر بابر نسیم آسی، پرنسپل کلیم احسان بٹ، محمد نعمان چشتی ڈپٹی ڈائریکٹر (IT) اقبال اکیڈمی لاہور

معزز مہمان گرامی طلباء میں انعامات تقسیم کرتے ہوئے

کالج سٹاف، مہمانان اور مقابلہ جیتنے والے طلباء کا گروپ فوٹو

پروفیسر بو علی منور نظامت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے

گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فارسی کے پروفیسر بابر نسیم آسی طلباء سے خطاب کرتے ہوئے

گورنمنٹ عبدالحق کالج میں طلباء کتاب میلہ میں کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے

طالب علم کلام اقبال ترنم کے ساتھ پیش کرتے ہوئے

گورنمنٹ عبدالحق کالج میں اساتذہ کتاب میلہ میں کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے

گورنمنٹ عبدالحق کالج میں طلباء، اساتذہ اور معزز مہمانان گرامی شرکائے محفل

گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ کالج جلالپور جٹاں اور اقبال اکیڈمی لاہور، پاکستان کے تعاون سے یوم اقبال کی مناسبت سے "اقبال اور حب رسول ﷺ" کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر جلالپور جٹاں کے تمام کالجز کے طلباء کے درمیان کلام اقبال ترنم سے پڑھنے کا ایک مقابلہ بھی ہوا۔ اقبال اکیڈمی کی جانب سے کتاب میلہ کا انتظام بھی کیا گیا

جشنِ بہاراں

پرنسپل کلیم احسان بٹ اور وائس پرنسپل شجاعت حسین ہاشمی، مہمانِ خصوصی اعجاز احمد سہروردی کے ہمراہ پھولوں کی نمائش اور جشنِ بہاراں کا افتتاح کرتے ہوئے

پرنسپل کلیم احسان بٹ کا چینی مہمانوں کے ہمراہ فوٹو

گھوڑا ناچ کے دوانداز

طلباء کالج ہال میں روایتی رقص کرتے ہوئے

کالج کے طلباء کا پرنسپل کلیم احسان بٹ کے ہمراہ گروپ فوٹو

کالج اساتذہ اور پرنسپل صاحب

طلباء بک اسٹال کے ساتھ تصویر بناتے ہوئے

کچھ یادیں

انٹر بیچ 83-1981ء کے طلباء پروفیسر شاہد احمد چوہدری کے ساتھ

اسٹوڈنٹ یونین عبدالحق کالج 83-1981ء: دائیں سے بائیں محمد رفیق سیکرٹری یونین، پروفیسر مظہر اکبر (اردو) پرنسپل احسان اللہ خان، صدر یونین محمد الیاس، کونسلر عزیز الرحمان، جوائنٹ سیکرٹری چوہدری اعجاز وڑائچ

چوہدری اعجاز وڑائچ، جناب حامد حسن سید (پرنسپل زمیندار کالج) سے کالج یونین کا حلف لیتے ہوئے

اسٹوڈنٹ یونین 83-1981ء وائس پرنسپل پروفیسر عبدالسلام اور پروفیسر مظہر اکبر کے ہمراہ

گروپ فوٹو: کالج سٹاف 1993ء ہمراہ پرنسپل مفتی عبدالعزیز و شیخ صدیق ظفر

چوہدری اعجاز وڑائچ (ڈائریکٹر گوجرانوالہ) ڈاکٹر امتیاز احمد چیمہ سے بہترین طالب علم کا انعام اور امتیازی سند وصول کرتے ہوئے، پروفیسر مظہر اکبر سٹیج سیکرٹری اور پروفیسر حافظ عبدالعزیز حلیم، ہمراہ پرنسپل احسان اللہ خان پس منظر میں

پروفیسر چوہدری مبشر، پروفیسر صدیق ناصح، پروفیسر چوہدری محمد شوکت، بطور اعزازی لیکچرار 02-2001ء

سالانہ مشاعرہ
جناب کلیم احسان بٹ، جناب خالد جاوید جان، جناب ڈاکٹر عزیز فیصل، جناب، جناب اطہر ضیاء، جناب جنید آزر، جناب شہباز چوہان،
جناب محبوب صابر، جناب سعید اقبال سعدی، جناب ڈاکٹر مظہر اقبال، جناب ڈاکٹر فرحت عباس، جناب نسیم سحر و دیگر شعرائے کرام

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ
عبدالحق
اسلامیہ کالج
جلالپور جٹاں

فہرست

اداریہ

اردو شاعری کی دُنیا بے شمار ستاروں سے مزین ہے لیکن مرزا غالبؔ جیسی چمک دمک کا حامل ستارہ اور کوئی نہیں۔ان کے کہے گئے اشعار زماں و مکاں کی حدود سے گذر چکے ہیں اور نسلوں کے تجربات کا حصہ بن چکے ہیں۔اُن کے الفاظ انسانی جذبات کے جوہر کو اپنی گرفت میں لے رہے ہیں۔جب ہمارے اس شمارے کے خصوصی نمبر کے لیے شخصیات کو کھوجا گیا تو غالبؔ کی بے مِثل ذہانت و ظرافت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا فیصلہ ہوا کہ اُن کا کلام دو صدیوں بعد بھی نسلِ انسانی کے اظہار کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

مرزا 1797ء سے 1869ء تک زندہ رہے۔اُن کی قادر الکلامی کا لوہا اُن کی زندگی میں ہی مانا گیا۔غالبؔ کی زندگی خوشی، غم، محبت اور آرزو سے گندھی تھی اس لیے انسانی تجربے کی پیچیدگیوں کی آئینہ دار تھی۔غالبؔ کے کلام میں زبان کی بے مثال مہارت اور انسانی نفسیات کی شاندار تفہیم کا مظاہرہ ملتا ہے غالبؔ ایسا ادبی سنگِ میل بنا کہ وقت کی کسوٹی پر پورا اُترا۔غالبؔ کی شاعری اس کی گہری خود شناسی اور شاعرانہ کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔غالبؔ کے اشعار محبت، روحانیت، فلسفہ اور معاشرتی تنقید کے موضوعات کو آسانی سے بیان کر دیتے ہیں اور قاری کے دل پر انمٹ نقوش چھوڑتے ہیں۔ہر سطر ایک موتی کی طرح ہے، جو زندگی کی باریکیوں کو سمیٹنے والے جذبات کی مالا بناتے ہوئے احتیاط سے پروئے جا رہے ہیں۔

غالبؔ کی شاعری ایک اچھوتے صوفیانہ کمال کی بھی حامل ہے۔یہ شاعری لسانی حدود سے بھی بالاتر ہے، اُن کے گہرے افکار اور استعارے قاری کی روح کو چھونے کی طاقت رکھتے ہیں چاہے پڑھنے والے کا ثقافتی یا لسانی پس منظر کچھ بھی ہو۔یہی وہ عالمگیریت ہے جس نے غالبؔ کی شاعری کو زمانی و لسانی اور جغرافیائی حدود سے ماورا، ہو کر انسانیت کی روح سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔اس خصوصی سالانہ شمارے غالبؔ نمبر کا مقصد اپنے طلباء اور قارئین کو غالبؔ جیسے باکمال شخص کی نظم و نثر کی گہرائی، خوبصورتی اور عظمت سے روشناس کروانا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ وہ الفاظ کے اُس پیچیدہ جال کو تلاش کریں جو وہ ترتیب دیتا ہے۔غالبؔ کا تخلیقی جوہر اور موسیقیت ہمیں اُس کی ادبی عظمت تک لے جاتی ہے۔

غالبؔ کا اندازِ بیاں مختلف ومنفرد ہے۔ فارسی اور اُردو کلام میں زبان و بیان کی جدت اور معنی آفرینی اور انسانی نفسیات سے بہتر شناسائی پائی جاتی ہے۔ نثر میں روانی، سلاست اور بے تکلفی ان کا خاصہ ٹھہرا۔ کلامِ غالبؔ کی اِن خوبیوں کے سبب مابعد شعرا و ادبا کی ہر نسل متاثر ہوئی۔ اس امر کا اندازہ قاری کو زیرِ نظر شمارے میں شامل نثری اور شعری اعترافِ کمال کے مطالعہ سے ہو جائے گا۔ لوگ آج بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو غالبؔ کے کلام کی گہرائیوں میں دریافت کرتے ہیں اور غالبؔ آج بھی ادب میں اُن کا رہبر و رہنما ٹھہرتا ہے۔ غالبؔ کے کمالات کا اعتراف اُس کے ہم عصروں سے لے کر عصرِ حاضر تک بہت سے اہلِ فن نے کیا ہے۔ مزید برآں ہم اس مجلّے میں غالبؔ کے مختلف علوم وفنون پر اثرات کا جائزہ بھی لے رہے ہیں۔ یہ مضامین شاہد ہیں کہ کس طرح غالبؔ کے الفاظ ایک صفحے کی تحریر سے آگے بڑھ کر مقبول ثقافت کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں۔

آیئے! ہم سب مل کر'' کارواں'' کے موجودہ غالبؔ نمبر کے ساتھ اس لازوال میراث کا جشن منائیں۔ غالبؔ کے اشعار ہمیں ایسی دنیا میں لے جانے کی طاقت رکھتے ہیں جہاں جذبات کو اظہار اور روح کو سکون ملتا ہے۔ آیئے اس جادوئی شخصیت کے حلقۂ اثر میں ذرا دیر بیٹھ کر اردو ادب کی مختلف جہات کی سیر کریں۔

محمود احمد (اسسٹنٹ پروفیسر)

مدیر اعلیٰ مجلّہ کارواں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نعت

(غالبؔ)

حق جلوہ گر، زطرزِ بیانِ محمد است
آرے کلام حق، بزبانِ محمد است

آئینہ دارِ پرتو مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمد است

تیر قضا، ہرآئینہ در ترکش حق است
اما، کشادِ آں زمکانِ محمد است

ہرکس، قسم بہ آنچہ عزیز است، می خورد
سو گندِ کردگار، بجانِ محمد است

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا، سخن ز سروِ روانِ محمد است

بنگر دو نیمہ کشتنِ ماہ تمام را
آن نیز نامور زنشانِ محمد است

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

ٹی وی سیریز میں سوانح غالبؔ کا خطوط غالبؔ کی روشنی میں مطالعہ

ثریا حیات

(پی۔ایچ۔ڈی سکالر)

اس مضمون میں غالبؔ پر بنی ٹی وی سیریز مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی زندگی کے جن پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے ان پہلوؤں کو ان کے خطوط کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔گلزار نے یہ فلم لکھی ہے۔انیس سو اٹھاسی (۱۹۸۸ء) میں اس فلم کو سکرین پر پیش کیا گیا۔گلزار نے اس فلم کو ''مرزا غالب'' کا نام دیا۔اصل میں "مرزا غالب" ایک ٹی وی سیریز تھی جسے بعد میں فلم کی صورت میں بھی پیش کیا گیا۔اس ٹی وی سیریز میں ہندوستان کے معروف اداکار نصیرالدین شاہ نے مرزا غالب کا کردار ادا کیا۔

گلزار نے اپنی اس سیریز میں مرزا غالب کے بچپن کے واقعات سے لے کر غدر تک کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے۔ٹی وی ڈرامے میں غالب کے جینے کے انداز،ان کی بے نیازی اور دوراندیشی کو حقیقی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ڈرامے میں کسی قسم کا تکلف اور رکھ رکھاؤ نہیں دکھایا گیا۔گلزار نے غالب کی زندگی کے تجربات،مشاہدات کو ایک عظیم انسان اور شاعر کے روپ میں متعارف کروایا۔غالب نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور وہ کبھی بھی زمانے کے محتاج نہیں رہے۔اس لیے ہر زمانے میں غالب زندہ رہیں گے۔اس مضمون میں غالب کی زندگی کے حوالے سے ڈرامے میں رونما ہونے والے واقعات اور خطوط غالب سے حاصل ہونے والی معلومات کو تقابلی اور تجزیاتی انداز میں بیان کیا جائے گا۔

غالب کی شخصیت میں ان کے فن اور شاعری کے حوالے سے بھی بہت انا پرست کیفیات سے عبارت ہے۔غالب کے دور میں جس طرح درباری شاعری کا عام رواج تھا اور بڑی بڑی شخصیات کے لیے قصیدے لکھے جاتے تھے، غالب کے ہاں اس طرح کی صورتحال بہت کم نظر آتی ہے۔غالب خود اپنے ایک خط میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔میرے قصیدے دیکھو،تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔نثر میں بھی یہی حال ہے۔''

غالب نے خطوط لکھنے کا آغاز عمر کے آخری حصے میں کیا تھا۔عمر کے اس حصے میں ان کے لیے شعر کہنا یا شعر یاد رکھنا ایک بہت مشکل امر تھا۔تاہم وہ اپنے پرانے کہے گئے اشعار کو یاد کر کے دوہراتے رہتے تھے۔اس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں اکثر جگہوں

پر کرتے ہیں:

ے زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کے خط میں لکھے گئے اس شعر میں بھی ان کی انانیت کا عکس نظر آتا ہے۔

ڈرامے میں بھی ان کی شخصیت میں انانیت کا پہلو نمایاں ہے۔ بچپن سے غالب کی شخصیت میں موجود انفرادیت پسندی اور خودداری آگے چل کر انانیت پسندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاں مشاعرے میں پہلی بار مدعو ہونے پر بھی غالب کی شخصیت میں کہیں طمانیت یا مسرت کے جذبات محسوس نہیں ہوتے۔ بل کہ وہاں بھی ان کا شخصی رعب اور اعتماد قائم رہتا ہے۔ مشاعرے میں دیگر شعراء کا کلام سنتے ہوئے ان کے چہرے کی سختی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جب بہادر شاہ ظفر انھیں اپنا کلام پیش کرنے کو کہتے ہیں تو اس وقت ان کا ذرا سا توقف کرنا دراصل ان کے مزاج کے ٹھہراؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ غالب کے علاوہ باقی جتنے شعراء وہاں موجود ہوتے ہیں وہ سب بادشاہ وقت کے آگے جھک جانے اور بچھ جانے کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں جب کہ غالب کا انداز یہاں بھی بالکل منفرد اور پر وقار تاثرات کا حامل نظر آتا ہے۔ اپنا کلام پیش کرتے ہوئے جب غالب مصرعہ اٹھانے کو کہتے ہیں تو باقی شعراء انگشت بہ دنداں ہو جاتے ہیں۔ تاہم اس وقت بھی ان کے معاصرین میں غالب کے لیے طنز اور حسد نظر آتا ہے۔ یہ حسد ان کے ایک جملے سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ ''قلی منگوا لیجیے''

مشاعرے سے واپس آنے کے بعد ملازمہ نے جب مشاعرے کے متعلق سوال کیا تو غالب جواب دیتے ہیں: "وہ تو تاج رکھ ہی دیتے میں نے اپنی ٹوپی نہیں اتارنے دی بس" یہ جملہ ان کی شخصی انانیت اور ذاتی انفرادیت کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

غالب کی شخصی انانیت ان کے خدا تعالی سے تعلق کے درمیان بھی حائل نظر آتی ہے۔ وہ خدا سے رو یا گڑگڑا کر مانگنے کے قائل نہیں بل کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کے قائل ہیں۔ اسی لیے بیگم سے کہتے ہیں کہ تم اگر چہ ایمان والی ہو لیکن جس طرح تم سجدوں میں گڑگڑاتی ہو ویسے کسی بچے کو والدین کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا ہے۔

غالب کے خطوط میں ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ تاہم کچھ خطوط میں غالب بچپن میں شادی ہونے کی وجہ سے طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب اور امراؤ بیگم کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ لیکن غالب کے رویے میں ان کے لیے بہت محبت اور خلوص تھا۔ جب غالب نے کلکتہ کے لیے سفر کیا تو اس دوران غالب کے بھیجے گئے خطوط امراؤ بیگم سے ان کی محبت کا ثبوت ہیں۔

ڈرامے میں غالب کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے ان کی شخصیت کو دیکھا جائے تو بیگم سے اگرچہ مزاج کی موافقت نہیں تاہم ان سے غالب کو بہت محبت ہے۔ امراؤ بیگم سے غالب کا رویہ ہمیشہ نرم اور مشفقانہ رہا۔ امراؤ بیگم اکثر غالب کی شراب نوشی کی عادت اور ان کے اسراف پر ان سے نالاں نظر آتی ہیں۔ غالب اس رویے پر ان سے الجھنے کی بجائے دوستانہ انداز اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس تعلق میں ان کا شخصی رعب اور لہجے کا اٹل پن کہیں غائب ہو جاتا ہے اور وہ ایک نہایت شفیق اور مہربان شوہر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ بیگم اگر کبھی ناراض ہو جاتی ہیں تو اسے اپنے اشعار سنا کر منانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ے دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

غالب کا طنزیہ انداز ان کی گھریلو زندگی کے معاملات میں بھی عیاں ہوتا ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی طنزیہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً فلم میں جہاں ان کی بیگم ان سے مشاعرے کا احوال پوچھتی ہیں تو غالب جواباً کہتے ہیں:

''کچھ ہوا ہی نہیں۔ کچھ ہوا ہوتا تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا''

پھر جب بیوی جواب میں کہتی ہیں کہ دراصل دلی والے آپ کو پسند نہیں کرتے۔ تو غالب کا جواب آتا ہے:

''کیوں میری شکل ٹیڑھی ہے؟''

یہ طنز دراصل ان کی زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ دلی میں شاعری کا مقابلہ بہت سخت تھا جس کی وجہ سے معاصرانہ چشمک عروج پر تھی۔ ہر شاعر اپنے مقابلے کے دوسرے شعراء کی ٹانگ کھینچتا نظر آتا ہے۔ اس لیے غالب جیسے بلند پایہ شاعر کی یہاں آمد درباری شعراء کے لیے کسی بڑے خطرے سے خالی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ذوقؔ جیسا بلند مرتبہ شاعر غالب کی شاعری کا خاکہ اڑاتا نظر آتا ہے۔

آزادانہ روش غالب کی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے۔ وہ نہ خود کسی قسم کی ذہنی وطبقاتی تقسیم کو قبول کرتے تھے اور نہ ہی یہ معاشرتی تضادات ان کے لیے قابل قبول تھے۔ اس لیے فلم میں بیگم کے آگرہ واپس جانے کی بات کے جواب میں کہتے ہیں:

''شیعہ، سنی، ہندو، مسلمان یہی بٹوارے کیا کم تھے کہ لوگوں نے اب آگرہ دلی لکھنو کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ یہ دنیا مجھے بہت چھوٹی لگتی ہے بیگم''

ان کے اس شعر میں بھی طنز موجود ہے جو اس دنیا میں موجود لوگوں کے روّیوں پر ایک طنز ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

اس شعر میں غالب دنیا کے رویے پر طنز کرتے ہیں کہ دنیا میری نظر میں بچوں کا کھیل ہے۔یعنی دنیا میں ہونے والے معاملات اور لوگوں کا رویہ غالب کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

غالب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ذہانت بھی ہے جس کی جھلک ہمیں ڈرامے میں نظر آتی ہے۔جب بہادر شاہ ظفؔر غالب کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو باقی شعراء بھی ان کی ذہانت کی داد دیتے نظر آتے ہیں۔

''کمال کا حافظہ ہے اس آدمی کا ایک ایک شعر کہتے ہیں اور گرہ لگاتے جاتے ہیں رومال سے، صبح کو ایک ایک گرہ کھولتے جاتے ہیں اور شعر درج کر لیتے ہیں''

غالب کا ذہنی شعور بھی اپنے عہد کے لوگوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔اس لیے ان کی باتوں میں دلیل اور منطق دونوں ساتھ ساتھ ہم رکاب نظر آتی ہیں۔مرزا غالب کے ایک ایک جملے اور ایک ایک محاورے میں ایسی ذہانت اور پختگی محسوس ہوتی ہے جو صدیوں کے تجربے کا نچوڑ ہے۔اس لیے جب لکھنؤ میں کسی محفل میں ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ دلی اور لکھنو کی زبان کا فرق واضح کریں تو مرزا کا جواب فہم وفراست کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔

'' ہندوستان میں ہر پچاس میل پہ لوگوں کی بولی بدل جاتی اس لیے دو جگھوں کی زبان میں اگر فرق آ جائے تو جائز ہے لیکن لوگوں میں فرق آنے لگے تو جائز نہیں ہے۔زبان الگ ہونے سے لوگ الگ نہیں ہو جاتے دشمن نہیں ہو جاتے۔لکھنو اور دلی کی زبان میں فرق ہے تو ہے وہ ایک دوسرے کی بیری تو نہیں ہیں''

اس سے بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا غالب جیسا صاف گو انسان لوگوں کے مصنوعی رویوں اور بغض سے سخت نالاں ہے۔ ان کا معاشرتی شعور ایمانی صفات پر قائم ہے جہاں معاشرے میں دوہرے رویے موجود نہ ہوں۔انصاف اور حق پسندی کا راج موجود ہو۔انھیں یہ بات سخت پریشان کرتی ہے کہ علاقائی تعصب کی بنا پر کسی بھی فن کار کی ناقدری کی جائے۔

مرزا کے کردار کی ایک اور بہت اہم خوبی ان کا دوٹوک انداز ہے۔انھیں جہاں جو بات خلاف مزاج لگے وہ بغیر لگی لپٹی کے بیان کر دیتے ہیں۔ڈرامہ سیریز میں لکھنو کی ایک محفل میں لوگوں کو یہ بات باور کرانے میں مرزا کو کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ انھوں نے

میرتقی میر کی ناقدری کی ہے۔غالب کہتے ہیں:

''میر آئے تھے یہاں میرتقی میر آپ نے قدر نہیں کی ان کی وہ مایوس ہو کے چلے گئے لکھنو سے گھاٹا کس کا ہوا''

غالب کی قرض لینے کی عادت سے سارا زمانہ واقف تھا۔شاہانہ طرز زندگی کے عادی ہونے کی وجہ سے جب اپنی قوت بازو پر گزر بسر کرنے کا وقت آیا تو غالب کو تنگ دستی گوارا نہ ٹھہرتی تھی اس لیے قرض لینے کی عادت پڑ گئی۔غالب نے بہت سارے لوگوں سے قرض لے رکھا تھا۔اس عادت کا ذکر ان کے خطوط میں جا بجا ملتا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں

''وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرض داروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔آج جون کی پانچویں ہے؛ وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔''

ڈرامے میں بھی ان کی قرض لینے کی عادت کو دکھایا گیا ہے۔کاتب کی بیوی بھی غالب کی قرض لینے کی عادت سے واقف ہے۔اس لیے شوہر سے غالب کے کلام کی کتابت پر جرح کرتی ہے کہ اس سے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملنی۔ڈرامے میں جب غالب کو روپے ملتے ہیں تو بیگم پیسوں کے بارے میں سوال کرتی ہیں تو غالب بتاتے ہیں کہ جن سے ادھار لیا ہوا تھا ان کا حساب چکتا کر دیا۔

غالب کے مالی حالات اگرچہ بہت زیادہ خراب تھے۔وہ قرض میں بالکل جکڑے ہوئے تھے۔تاہم غالب دل کے بہت سخی انسان تھے۔ایک دفعہ کسی دوست کی رقم سے کچھ پیسے محسوب کر لیے گئے تو غالب نے ان کو اپنے پاس سے بھیج دیے۔لکھتے ہیں:

''انتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی سے محسوب ہو گئے،سو میں اپنے پاس سے پانسو ملا کر ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں''۔

ڈرامے میں غالب کی شخصیت میں سخاوت کا پہلو واضح نظر آتا ہے۔غالب دل کے بہت سخی تھے۔اس لیے جب جیب میں پیسہ ہوتا حق دار کو اس کی محنت سے بڑھ کر ادا کرتے۔اس لیے کاتب کے نسخہ لانے پر فوری اسے اس کی اجرت ادا کرتے تھے۔جواباً اس کے پیسے کم لینے کی درخواست پر اسے پیسے خرچ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

غالب نے زندگی کا بڑا حصہ تنگ دستی اور قرض داری میں گزارا تھا۔اُنہیں ارباب جاہ و ثروت کے عطایا لینے یا دوستوں اور نیاز مندوں کا ہدیہ قبول کرنے میں تامل نہ تھا۔لیکن عام حالات میں کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔جب ان کو ایک

دوست نے کتابوں کے لیے روپے بھیجے تو بہت ناراض ہوئے۔فرماتے ہیں:

''صاحب! یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے، میں نہ کتاب فروش، نہ دلال۔یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے برا کیا۔''

ڈرامے میں بھی غالب کی احسان نہ لینے کی عادت کو دکھایا گیا ہے۔جب ان کے دوست ان کو ملنے آتے ہیں اور غالب کو کچھ رقم دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر غالب لینے سے صاف صاف انکار کر دیتے ہیں۔

غالب کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔یہ کمی ان کی زندگی میں بہت بڑے خلاء کی صورت میں نظر آتی ہے۔اگر چہ ان کے سات بچے پیدا ہوئے تھے مگر کوئی زندہ نہ بچا سب بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔غالب کی زندگی میں پیش آنے والے دکھوں میں سے اولاد کا زندہ نہ بچنا بھی ان کے لیے ایک بہت بڑا دکھ تھا۔اگر کسی دوست کی اولاد کے مرنے کی خبر سنتے تو ان کے اپنے زخم بھی ہرے ہو جاتے تھے۔اپنے اس دکھ کا ذکر وہ اکثر اپنے خطوط میں کرتے نظر آتے ہیں۔ایک دوست کے بیٹے کی وفات پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمھارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے۔لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔تم ابھی جوان ہو،حق تعالیٰ تمھیں صبر اور نعم البدل دے''

غالب کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔غالب کی بیگم نے اپنے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔دونوں ان سے بہت محبت کرتے تھے۔جوانی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔زین العابدین خاں عارف کی وفات کے بعد غالب نے ان کے بچوں کو گود لے لیا تھا۔غالب ان بچوں کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔بڑے بیٹے کا نام باقر علی خاں اور چھوٹے کا حسین علی خاں تھا۔غالب ان دونوں لڑکوں سے بہت محبت کرتے تھے۔غالب خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

''سنو صاحب! یہ تو تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں''

غالب اپنے خطوط میں جگہ جگہ ان بچوں کا ذکر کرتے ہیں۔ان سے محبت کر کے اپنے اولاد کھونے کے دکھ کا مداوا کرتے ہیں۔

ڈرامے میں بھی غالب کی زندگی میں اولاد کی کمی کو دکھایا گیا ہے۔جب وہ اپنی بیگم سے کنبے کھیلنے کی بات کرتے ہیں تو وہ عمر کا حوالہ دے کر ان کی بات کو ٹال دیتی ہے۔ایسے میں غالب کے دیے گئے جواب سے ان کی اولاد کی خواہش اور محرومی صاف

محسوس کی جاسکتی ہے۔غالب کہتے ہیں:

''ناطے پوتیاں بھی تو کوئی نہیں ہیں کھیلنے کے لیے انہی سے کھیل لیتے ہیں''

انھیں اولاد کی بہت خواہش تھی۔اسی لیے ڈرامے میں جب انھیں وفادار کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم کا پاؤں بھاری ہے تو بلا تعامل اوپر کی منزل سے بھاگتے ہوئے نیچے آتے ہیں۔اسے اس خبر پر انعام دیتے ہیں۔ڈرامے میں جب انھیں مردہ بچے کی پیدائش کی خبر ملتی ہے تو ایک دم سے متصل ہو جاتے ہیں اور ایسے میں ان کے چہرے کی پژمردگی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

اولاد کی کمی تو ان کی زندگی میں ہمیشہ رہی۔اس کا حوالہ ڈرامے میں ایک جگہ پر اس انداز سے ملتا ہے کہ غالب کا ایک دوست سوغات کے طور پر ان کے لیے بلی کے بچے لے کر آتا ہے۔ان بچوں کو غالب جس محبت سے پالتے ہیں وہ ان کی اولاد کی محرومی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اس بات کا ذکر وہ خود بھی اس طرح کرتے ہیں کہ

''اب کوئی اولاد بانٹے ہمارے ساتھ تو ہم کیسے انکار کردیں''

ڈرامے میں غالب اولاد کے مرنے کی وجہ سے بہت غمگیں نظر آتے ہیں۔خطوط میں عارف اور ان کے لڑکوں کا ذکر بہت سی جگہوں پر ملتا ہے۔ڈرامے میں ایک جگہ پر غالب سرسری طور پر وفادار کو عارف کے لڑکوں کے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔

غالب فطرتاً شوخ مزاج اور چنچل طبیعت کے مالک تھے۔ان کی اسی خوبی کی وجہ سے حالی نے انھیں ''حیوانِ ناطق'' اور ''حیوان ظریف'' کہا ہے۔غالب قلب و ذہن کے اعتبار سے اس مقام پر تھے جہاں اس قسم کی اعلیٰ ظرافت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔تاہم حالات نے انھیں مایوس اور غمگیں مزاج بنا دیا تھا۔غالب کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا۔ان کی محفلیں اجڑ گئی تھیں۔دوست احباب بچھڑ گئے تھے۔ہر طرف موت کا بازار گرم تھا۔اس افسردہ اور یاس انگیز ماحول میں بھی غالب نے خوش اخلاقی سے زندگی بسر کرنے کا ضابطہ حیات اپنایا۔یہ شوخ مزاجی ان کے خطوں میں جا بجا موجود ہے۔بعض مقامات پر محض نقل اتار کر لطف ظرافت پیدا کر لیتے ہیں۔حسین علی خاں بچے تھے بچوں کی زباں بول چال میں صاف نہیں ہوتی۔میرزا اپنے ایک دوست سے حسین علی خاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے، کھلونے منگا رو، میں بھی بہار (بازار) جاؤں گا''

غالب کے خطوط میں کہیں کہیں معمولی قسم کی ظرافت بھی ملتی ہے۔ان کے اس قسم کے مزاح کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے۔غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے''

غالب کی شوخ مزاجی اور چنچل طبیعت کا عکس ڈرامے میں بھی نظر آتا ہے۔ جب جہاں انھیں بیگم کے حاملہ ہونے کی خبر ملتی ہے وہاں وہ بیگم سے چھیڑ چھاڑ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کی زندہ دلی ڈرامے میں کئی اور مواقع پر بھی سامنے آتی ہے۔ جیسے کسی محفل میں بیٹھے ہوئے ایک بچے کی آمد ہوتی ہے۔ وہ انار جلانے کی فرمائش کرتا ہے۔ اس پر غالب کا بچوں کے ساتھ اظہار یکجہتی اور انار جلاتے ہوئے غالب کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے تاثرات کا ابھرنا ان کا زندگی سے بھرپور ہونے کی دلیل ہے۔

غالب کی تنگ دستی سے زمانہ واقف تھا۔ ان کی پنشن کی بحالی اور جاگیر کی واپسی کے فیصلے کو اہل محلّہ طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ دوکاندار سے ملازمہ سودا لینے جاتی ہے تو اس کے جملے طنزیہ انداز لیے ہوتے ہیں۔ غالب صاف گو طبیعت کے مالک تھے۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے بات کرتے تھے۔ ڈرامے میں جہاں کوتوال، شہر میں جواریوں کو پکڑنے کے لیے دورہ کرتا ہے وہاں باقی سب جواری بھاگ جاتے ہیں۔ آخر میں اس کی ملاقات غالب سے ہوتی ہے۔ غالب بلاتمہید اسے جوا کھیلنے کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں۔ یہاں جو مکالمہ کوتوال اور غالب کے مابین ہوتا ہے وہ غالب کی شائستہ مزاجی کا اہم ثبوت ہے۔ جب کوتوال پوچھتا ہے کیا ہو رہا تھا؟ تو غالب ذرا بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ:

''جو ہو رہا تھا آپ آ گئے رنگ میں بھنگ کرنے''

غالب فن کے اصلی قدر دان تھے۔ کسی کا بھی اچھا شعر یا کلام سنتے اسے داد دیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ڈرامے میں جب بازار سے گزرتے ہوئے ایک گویے کی زبانی میر تقی میر کا یہ شعر سنتے ہیں

؎ پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

تو اس گویے کو روک کر غالب شاعر کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور وہیں اس کے اعتراف فن کے طور پر یہ شعر کہتے ہیں:

؎ ریختے کے تمھی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

جہاں پہ غالب اصلی فن کے قدر دان ہیں۔ ڈرامے میں طنزیہ انداز میں وہ ابراہیم ذوق کی شاعری کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں:

''کبھی حضرت ابراہیم ذوق کے دروازے پر کھڑے ہوکر پڑھنا نااہل یہ تو جانے کہ صرف زبان دانی اور قافیہ بندی سے شاعری نہیں ہوجاتی۔ ہم تو اچھے شعر کے عاشق ہیں جہاں مل جائے جس سے مل جائے''

یہیں غالب کے دور کی تہذیب سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ گویے کا بازار میں کلام سن کر سب لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسے انعام سے بھی نوازتے ہیں۔

غالب آزاد شخصی رویے کے مالک تھے۔ وہ کسی مخصوص رسم ورواج کی پابندی کے قائل نہیں تھا۔ وہ ہر رسم ورواج کو ماننے کے قائل ہیں اس بات کا اعتراف ڈرامے میں کرتے ہیں جب ان کے دوست ان کو کہتے ہیں آپ تو کسی رسم ورواج کو نہیں مانتے ہیں تو جواباً غالب ان کو کہتے ہیں:

''ایسا نہ کہو بھائی میں ہر رسم ورواج کو مانتا ہوں اسی لیے کسی ایک کا قائل نہیں ہوں''

غالب ہر مذہبی تہوار اور ہر قسم کے مذہبی رسومات کا احترام کرتے تھے۔ جو بھی تہوار ہوتا اسی کے رنگ میں خود کو ڈھال لیتے تھے۔فرماتے ہیں:

''ہم پوجا نہیں کرتے لکشمی دیوی کی مگر اس کے قائل تو ہیں تلک ہماری بھی لگا دیجیے۔''

ڈرامے میں ایک جگہ ہندوؤں کے تہوار کی مٹھائی خوشی سے قبول کرتے ہیں اور خدمت گزاروں کو انعام بھی دیتے ہیں۔ یہاں غالب کے مزاج کی حاضر جوابی بھی بہت لطیف انداز میں سامنے آتی ہے۔ جب وہ کسی ہندو کے سوال کرنے پر اسے کہتے ہیں کہ

''کیا برفی ہندو ہے؟''

ڈرامے کے توسط سے اس عہد کے ثقافتی مظاہر بھی اپنی حقیقی شکل میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً پتنگوں کی خرید وفروخت اور گلی میں ان کو اڑانے والے بچوں اور نوجوانوں کا انہاک ڈرامہ سیریز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی طرح گلیوں اور چوباروں میں لوگ مل بیٹھ کر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔گھاس پھوس کے چھپروں کے نیچے لوگ مٹی کے گھڑے رکھ کر چارپائیوں پر بیٹھے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔عوامی زندگی میں کوئی نفسا نفسی اور تیزی نظر نہیں آتی بل کہ ایک بے فکری اور سکون کا رویہ نظر آتا ہے۔

جانور اس زمانے کی ثقافتی حدود میں ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے تھے۔اس لیے گلیوں اور چوراہوں میں جانور بندھے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ڈرامے میں جانوروں پر سواری کرتے دکھایا گیا ہے جو اس دور کی ثقافت کو ظاہر کرتا ہے۔

غالب کی زندگی اور شخصیت پر ان کی خاندانی پنشن کے معاملات کا بڑا گہرا اثر ہے۔ان کی زندگی کے آدھے سے زیادہ دکھ اسی پنشن کے معاملے سے جڑے تھے۔وہ حتی المقدور پنشن کی بحالی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ کئی لوگوں کی مدد بھی طلب کرتے ہیں۔کن کن لوگوں سے پنشن کے لیے واسطہ پڑتا ہے اس بارے میں ایک شمس نامی کردار غالب کو بتاتے ہیں کہ:

''اسد بھائی یہ پنشن کا فیصلہ ہوتے ہوتے ہوگا سارا معاملہ فرنگیوں کے ہاتھ میں ہے ریذیڈنٹ سے
کمشنر، کمشنر سے گورنر، گورنر سے گورنر جنرل ان کا کوئی بھروسہ نہیں کل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انگلستان
جاؤ اور ملکہ وکٹوریہ سے بات کرو''

ڈرامے میں غالب کی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ ہر کسی پر بھروسہ کرنے کے قائل ہیں۔اس منکسر المزاجی سے انھوں نے زندگی میں کئی جگہوں پر گہری چوٹیں بھی کھائی ہیں۔پنشن کے معاملے پر مددگار لوگوں نے ان سے جعلی دستاویزات پر دستخط کروا کر ان کا پیسہ کئی طرح سے خود ہتھیا لیا۔اس سب کے باوجود مرزا اپنے ایمان اور یقین کو کہیں متزلزل نہیں ہونے دیتے۔ یہ غالب کی شخصی دریا دلی ہے کہ وہ دھوکے بازوں فریبیوں کو ان کی ان نیچ حرکتوں کے باعث درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے ہیں۔

ڈرامے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ غالب کو دیوان کی اشاعت میں بھی بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اتنا بڑا شاعر ہونے کے باوجود انھیں وہ قدر و منزلت زندگی میں کبھی نہ ملی جس کے وہ حقدار تھے۔دیوان کاتب کے حوالے کرنے کے بعد غالب بہت پر امید تھے کہ کہیں نہ کہیں سے ضرور چھپ جائے گا تاہم واپسی پر کاتب کے جواب دینے پر غالب انتہائی دل گیر نظر آتے ہیں۔اس سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا نول کشور والوں نے بھی نہیں چھاپا؟ یہ اس زمانے کا بہت معیاری اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کے جواب میں انھیں مایوس کن جواب ملتا ہے۔زندگی کے یہ تمام معاملات انھیں دل گیر تو کرتے ہیں مگر وہ ناامید نہیں ہوتے۔انھیں لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔

غالب مذہب میں ایمانیات کے قائل نظر آتے ہیں۔اس لیے عبادات سے دور رہتے ہوئے بھی ان کی شخصیت میں ایمانی صفات موجود نظر آتی ہیں۔ڈرامے میں بیٹے کے مردہ پیدا ہونے پر انا اللہ کہنا ان کے مومن ہونے کی نشانی ہے۔

اسی طرح وہ ہر قسم کی مشکل اور دل گیر صورتحال میں خدا سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔دھوکے اور فریب سے دوچار ہونے کے باوجود وہ انسانوں سے نفرت نہیں کرتے بل کہ اپنی وسیع القلبی اور کشادہ دلی کے عوض سارے معاملے کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ ڈرامے میں ہر مذہب اور ہر مذہبی تہوار چاہے وہ ہندوؤں کا دیوالی کا تہوار ہو یا مسلمانوں کی عید ہو صدق دل سے قبول کرتے نظر

آتے ہیں۔اس معاملے میں غالب کہیں بھی تعصب کا شکار نہیں ہوتے۔

غالب کے مذہب کے حوالے سے ان کے معاصرین بھی شک وشبہ کا شکار نظر آتے ہیں۔عید کے مشاعرے میں شرکت نہ کرنا اس بات کو مزید ہوا دیتا ہے۔حالاں کہ اس وقت غالب اپنے بیٹے کی وفات کی وجہ سے دل گرفتہ تھے تاہم ان کے حاسدین نے اس معاملے کو غالب کی لادینیت اور مذہب سے دوری پر معمول کر دیا:

''جی وہ کافر کیوں آنے لگا عید کے مشاعرے میں وہ بھی میؔر کا بھائی ہے اسی طرح نکالا جائے گا دلی سے''

مذہب کے ساتھ ساتھ مرزا زندگی کے دیگر معاملات میں بھی غیر متعصب رویے کے مالک نظر آتے ہیں۔دلی میں انھیں اپنی ناقدری سخت تکلیف سے دوچار کرتی ہے۔اس لیے جب انھیں آگرہ واپس جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے تو وہ آگرہ سے بھی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔دراصل انھیں کسی جگہ یا علاقے سے کوئی امید نہیں بل کہ وہ ایک ایسے خطے کے متمنی ہیں جہاں اردو شاعری اور شاعروں کے حوالے سے غیر متعصب فضا قائم ہو۔جب غالب سے اس علاقے یا چمن کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا چمن پیدا ہوگا تو غالب کہتے ہیں:

''آگرہ،دلی لکھنو،الہ آباد،حیدرآباد ان سب کی کوکھ سے اگر کبھی ایک ہندوستان پیدا ہوا تو اس چمن کی کسی شاخ پر مجھے بھی آشیانے کی جگہ مل جائے گی''۔

اس کے علاوہ ڈرامے میں دلی اور لکھنو کے شعراء کی تقسیم نظر آتی ہے۔وہ اس صورتحال سے بیزار نظر آتے ہیں۔یہ تقسیم انھیں بہت ناگوار گزرتی ہے۔وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ دلی یا لکھنو کے شاعر نہیں ہیں وہ اردو کے شاعر ہیں،کہتے ہیں:

''میں اردو کا شاعر ہوں،میر صاحب کسی ایک شہر کا نہیں اور اردو اس ملک کی زبان ہے یہاں کے عوام کی زبان ہے قلعے کی یا نوابوں کی یا شاہوں کی نہیں ہے''

ڈرامہ سیریز میں غالب کی شاعری کے حاسدین کے ساتھ ساتھ ان کے مداحوں کا ذکر بھی کھلے عام ملتا ہے۔طوائف کے کوٹھے پر ان کی غزل کا گایا جانا،طوائف کا استدعا کر کے غالب سے ایک غزل لینے کی درخواست کرنا ان کے فن کی قدر و منزلت کا واضح ثبوت ہے۔اس بات کا ذکر غالب اپنے دوست میر صاحب سے بھی کرتے نظر آتے ہیں:

''جو شعر گلی میں فقیر گائے اور بالا خانے پر طوائف اس شعر کو بھلا کون مار سکتا ہے''

مجموعی طور پر خطوط غالب کی روشنی میں ڈرامہ سیریز کا تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈرامہ سیریز میں پیش

کیے گئے سوانحی حالات اصل حقائق پر مبنی ہیں۔ تاہم ڈرامہ سیریز چوں کہ ایک میڈیائی وسیلہ اظہار ہے اس لیے اس میں ایسے واقعات کو زیادہ شامل کیا گیا ہے جو دیکھنے والوں کے لیے دلچسپی اور سکون کا باعث ہو۔ غالب کے آباؤ اجداد اور ان کے بچپن کے حالات کو براہ راست اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ اس سے بوریت اور عدم دلچسپی کے عناصر پیدا ہو سکتے تھے۔ چناں چہ اس طرح کے تمام واقعات کو فلیش بیک میں کہیں کہیں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم ان جزوی واقعات کی پیش کش سے بھی ہم غالب کی خاندانی وجاہت اور حسب نسب سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔

ڈرامہ سیریز میں جو عنصر زیادہ صراحت سے بیان ہوا ہے وہ غالب کی شخصیت، غالب کی وسیع القلبی، ان کا شاہانہ مزاج، اہل وعیال سے ہمدردی اور نرمی کا رویہ، بچوں سے شفقت یہ سب رویے درحقیقت ان کے مجموعی مزاج کے عکاس ہیں۔ خطوط غالب میں اس حوالے سے جو واقعات ہمیں ملتے ہیں وہ اس عنصر کو بیان تو کرتے ہیں لیکن اس کا ویسا تصور ہمیں خطوط سے نہیں ملتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالب دنیا میں واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔
(مشتاق احمد یوسفی)

کلامِ غالبؔ کے نعتیہ رنگ

اکرم کُنجاہی

غالب اُن خوش نصیب شعرا میں سے ہے جن کے فکر و فن کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو سامنے آتا رہتا ہے۔ اُس کے حوالے سے گفتگو جاری رہتی ہے۔ اُس کے جمالیاتی سرچشموں کی کھوج لگانے کا عمل کبھی رکا نہیں۔ اپنے موضوعاتی تنوع، پروازِ فکر اور ندرتِ خیال کی بدولت، گزشتہ ڈیڑھ صدی میں وہ اہلِ علم کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ اُسے جو توجہ حاصل ہے وہ شاید کسی اور کا حصہ نہیں۔ غالب شناسی کا ایک طویل سلسلہ ہے، اِس لیے میرزا کی شاعری میں امکانات کی تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ اُس کے پیش روؤں کے ہاں ایک ہی طرح کے احساسات، جذبات اور موضوعات قاری کی طبعِ نازک پر گراں گزرنے لگے تو غالب کی جودتِ طبع نے ایک طرف تو شعری ترکیبات، لفظیات اور استعارات سے ایک تازہ کار اسلوبِ بیاں سے میرؔ و سوداؔ کی روایت کے مضبوط قلعوں میں شگاف ڈالا تو دوسری طرف عالی خیالات اور پروازِ تخیل سے فکر و خیال کی محدود راہوں کو شاہراہوں میں بدل دیا۔ اُس کے کلام میں وسعت اور بیکرانی، دانستہ یا نادانستہ روایت سے بڑے انحراف کا نتیجہ تھی۔ میر تقی میر کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود، اُس نے فکری اور اسلوبیاتی سطح پر روایتی معیار کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ میر و غالب میں ایک لازمی بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ غالب کی بلند فکری، پروازِ تخیل اور موضوعاتی گونا گونی اُس سادگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ کلامِ میر جس سے مملو ہے۔ لہٰذا غالب نے اپنی بے پایانی، وسعت اور بے کرانی کے لیے فارسی اضافتوں کی حامل شعری ترکیبوں کا سہارا لیا۔ اُس کے کلام کی تہہ داریاں اور معنوی پرتیں اُن تراکیب ہی سے ممکن تھیں۔ اُس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بسیط مضامین کم سے کم الفاظ میں سما گئے۔ ہم فخر کر سکتے ہیں کہ اُس کی تراکیب، استعارے اور علامتی پیکر، مشرقی تخیل اور شعریات کے بہترین نمونے ہیں۔

ادبی دنیا غالب کی اختراعات اور جدت پسندی سے متاثر ہی نہیں یوں لگتا ہے کہ مرعوب رہی ہے۔ اُس کی تراکیب کی تازہ کاری اور جدت کتنی ہی تاریخی کتب کا عنوان قرار پائی۔ فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، عزیز حامد مدنی، عبادت بریلوی، عبدالعزیز خالد، کنھیا لال کپور اور دیگر کتنے ہی اہلِ قلم نے غالب سے استفادہ کیا۔ سجاد انصاری کی محشرِ خیال، رشید احمد صدیقی کی گنجہائے گراں مایہ اور حضرتِ علامہ کی بالِ جبریل۔ مزید براں دستِ تہِ سنگ، نقشِ فریادی، سحر ہونے تک، گویا دبستاں کھل گیا، کاغذی ہے پیرہن، خونِ جگر ہونے تک، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، دودِ چراغِ محفل، خانۂ زنجیر، لذتِ سنگ، دشتِ امکاں، شہرِ آرزو اور چند تصویرِ بتاں جانے کس کس ترکیب سے کون کون بہرہ مند ہوا۔ اقبال نے عقیدت و محبت کے ساتھ مرزا کو ''بانگِ درا'' میں

خراجِ احساس پیش کیا ہے:

تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا　　　زیبِ محفل بھی رہا،محفل سے پنہاں بھی رہا

(اقبال)

غالب کا عہد عمومی طور پر مجذوبوں، قلندروں اور صوفیوں کی زندگی اور اُن کی فکری میلانات سے متاثر تھا۔ مسلمان وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، شاہد ومشہود، مقلد وغیر مقلد کی بحث میں الجھا ہوا تھا۔ حد یہ تھی کہ تصوف کہیں فلسفہ، کہیں نظریہ، کہیں برائے شعر گفتن، کہیں مسلک، کہیں عقیدہ نظر آ تا تھا۔ دوسری طرف احیائے دین کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو سلسلہ مجددیہ سے متاثر تھے۔ اِن لوگوں نے مذکورہ بالا نظریات پر زوردار ضرب لگائی جس کے اثرات واضح طور پر معاشرے میں محسوس کیے گئے۔ غالب ایک خلاقانہ ذہن رکھتے تھے۔ یہ غور وفکر کرتا ہوا شخص کسی نظریے کو من وعن کیسے قبول کر سکتا تھا۔ البتہ اُس کی شخصیت ایک طرف تو شاہ اسماعیل شہیدؒ کے غیر مقلد ہونے اور توحید خالص کے نظریے اور دوسری طرف ایرانی فلسفہ وادب میں ہمہ اوست کے زیرِ اثر رہی۔ حالی نے یادگارِ غالب میں یہی بتایا ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ اگر ایسا تھا تو مسئلۂ امکان و امتناعِ نظیر کے حوالے سے ''کلیاتِ نظم فارسی'' کی چھٹی مثنوی کا کیا جواز بنتا ہے۔ اکثر محققین کا خیال ہے ایک تو مولانا فضلِ حق کی دوستی برقرار رکھنے کے لیے وہ اُن کے کہنے پر لکھی گئی، مزید براں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلے اُسے نثر میں مولانا محمد سالم نے لکھا اور پھر بہادر شاہ ظفر کے کہنے پر غالب نے اُسے منظوم کیا۔ عملی طور پر وہ مجددیہ فکر کے علما کے ہمہ اوست والے نظریے کے قائل تھے۔

غالبؔ کے موحد ہونے سے متعلق حالی ''یادگارِ غالب'' میں لکھتے ہی:

''مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کی اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے''، غالب نے خود کو آدھا مسلمان قرار دیا۔

ے　ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　　مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

کلامِ غالب میں بہت سے ایسے اشعار قاری کے مطالعے میں آتے ہیں جو اُس کے عقیدۂ توحید کو اجاگر کرتے ہیں مگر جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، اُس کا توحیدی نظریہ ''ہمہ اوست'' کے فلسفے سے تعلق رکھتا ہے۔

ے　اسے کون دیکھ سکتا ہے کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

دل ہر قطرہ سازِ انا البحر　　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

یہ ادبی المیے سے کم تو نہیں کہ اتنا بڑا شاعر مگر اُس نے اُردو میں کوئی نعتیہ مجموعہ چھوڑا اور نہ ہی کوئی باقاعدہ نعت کہی مگر اُس

کے اُردو دیوان کی کئی غزلیات میں نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں جن کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں۔ وہ تو تمام عمر بہادر شاہ ظفر، نوابین اور امرا کے منت کش رہے مگر یہ بات بھی درست ہے کہ اُسے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی ذات سے عشق تھا اور یہیں سے اُس کے ہاں نعت گوئی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ وہ صاحبِ نہج البلاغہ، خلیفۂ راشد، صاحبِ سیف و قلم کی عقیدت و محبت میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُس کی نگاہِ نکتہ رس نے پہچان لیا تھا کہ سردارِ دو عالم ﷺ کے جانشین کوئی اور نہیں بلکہ علی ہی وارثِ علمِ نبی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے کلام میں خاتم المرسلین کے علاوہ اُن کی آل پاک کی مدح سرائی دیگر شعراً کی نسبت گراں قدر ہے۔ غالب نے اُردو میں صرف چار قصیدے تخلیق کیے جن میں سے دو وصی رسول ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شانِ اقدس میں ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کے لیے کہے گئے ہیں۔ فارسی میں غالب نے حمد و نعت میں کم کہا۔ غزلیہ ہئیت میں ایک حمد یہ قصیدہ دو نعتیہ ، البتہ خلیفہ چہارم کی شان میں پانچ قصیدے فارسی میں اور جیسا کے ذکر آ چکا دو قصیدے اُردو میں کہے۔ کئی ناقدینِ فکر و فن کا خیال ہے کہ غالب کے جو اُردو اشعار نعت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، وہ کسی اور مقصد کے تحت کسی موقع پر کہے گئے ہیں۔ اُن کی نعت سے مطابقت محض اتفاقی ہے۔ البتہ فارسی میں اُس نے غزلیہ ہئیت میں نو اشعار کی ایک نعت، قدسی کی نعت پر نو بند کا خمسہ، تین مثنویات، ڈھائی قصائد، ایک قطعہ یادگار چھوڑا ہے۔ جن کا اجمالی جائزہ اِس مضمون میں شامل ہے۔ اُردو کلام کے حوالے سے حیرت ضرور ہے مگر ڈاکٹر شمس بدایونی کی تحقیق کے مطابق اہلِ علم نے اُس کے فارسی کلام میں سے ۷۰۰ کے قریب ایسے اشعار تلاش کیے ہیں جن کا مضمون نعتِ رسول ﷺ ہے۔ غالب کے کلیات فارسی تین جلدوں پر مشتمل ہیں جن کے صفحات کی کل تعداد ۱۳۳۷ ہے۔ ادیب رائے پوری نے اپنی تحقیق میں صفحہ نمبر اور جلد نمبر کے ساتھ، نعتیہ کلام / اشعار کی تفصیل دے دی ہے تا کہ محققین کا کام آسان ہو جائے:

نبی ﷺ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے — رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو؟
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین — کرے جو اُن سے بُرائی، بھلا کہیں اُس کو؟

اُس کی غزلیں بہر حال اپنے دامن میں ذکرِ حضور پُر نور کے موتی سمیٹے ہوئے ہیں۔ غالب کا ایک شعر پڑھ کر بڑی خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ غالب نے کئی اشخاص کے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اُن میں سے ایک نواب تجمل حسین خاں بھی تھے، جن کے لیے کہے گئے مدحیہ غزلیہ اشعار میں سے ایک شعر ایسا ہے کہ جسے اُس عہد کے قارئین اور سامعین نے یقیناً نواب صاحب سے منسوب کیا ہو گا مگر بعد ازاں جب اہلِ علم نے اُس شعر کی معنویت کو پرکھا تو اِس نتیجے پر پہنچے کہ کسی عام دنیا دار انسان یا مجازی محبوب کا مقام و مرتبہ اُس ندرتِ فکر کا بار نہیں اٹھا سکتا جس کا اظہار اِس شعر میں ہوا ہے۔ لہٰذا آج صاحبانِ نظر کی اکثریت اِس بات پر متفق ہے کہ وہ ہستی صرف شہِ کونین ﷺ ہی کی ہو سکتی ہے جس کے لیے شاعر کا تخیل اِس رفعتِ خیال کو پہنچا ہے۔

یہ غالب کے فکر و فن کی عظمت تھی کہ اُس سے ایک انتہائے کمال کو پہنچا ہوا شعر سرزد ہوا جسے کئی ناقدین نعت سے منسوب کرتے ہیں مگر کیا یہ غالب کی بدنصیبی نہیں کہی جاسکتی کہ اِس معطر اور پاکیزہ فکر کو اُس نے زندگی کے کچھ مالی فوائد کی خاطر عام انسان کی خوشامد میں صرف کر دیا۔ اگرچہ غالب نے اپنے خطوط میں متعدد مقامات پر اِس بات کا اظہار کیا ہے کہ سرورِ کونین ﷺ اور سلاطینِ زمانہ کی مدح ایک لہجے میں نہیں کی جانی چاہیے مگر افسوس وہ خود اِس بات پر قائم نہ رہ سکے:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　　　کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

دیوانِ اُردو میں اور بھی بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کی طرف اہلِ علم نے اشارہ کیا ہے کہ جن میں آپ ﷺ کا اسم گرامی استعمال نہیں ہوا مگر اُن میں خیالات و افکار کی طہارت و پاکیزگی دیکھ کر نعت کا گمان ہوتا ہے مگر وہ بہر حال با قاعدہ نعتیہ کلام نہیں ہے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　　　سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لیے

رکھتے ہو قدم مری آنکھوں پہ کیوں دریغ　　　　رُتبے میں مہر و مہ سے کم تر نہیں ہوں میں

غالب کی فکر بہر حال ارفع اور پاکیزہ تھی، اُس کی غزل میں اکثر ایسے اشعار آجاتے ہیں کہ جن کو غزل سے الگ کر کے پڑھا جائے تو وہ نعت کے اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مجازی محبوب کے لیے صحرا نوردی بھی کرتا ہے تو قاری کی توجہ ایک بار محبوب حقیقی کے طرف ضرور مبذول کروا دیتا ہے۔ اِس حوالے سے اُس کا یہ شعر بھی اکثر زیرِ بحث آتا رہا ہے اور توجہ تلاشِ کوچہ شہِ بطحا کی طرف چلی جاتی ہے کہ غالب دشت نوردی کو بھی اُسی طرف لے جا رہا ہے۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں　　　　خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

اِس میں شک نہیں کہ غالب کی نثر اور اُن کے خطوط، اُن کی سوچ پر دین اور عشقِ رسول عربی ﷺ کے اثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں میں نے سوچ پر اثرات کی بات کی ہے عملی زندگی پر نہیں کہ اہلِ علم کو اِس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ نعت کے محقق ادیب رائے پوری نے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام غالب کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرین نبوتِ مصطفوی ﷺ اور امامتِ مرتضوی اُس میں جلیں''

غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ فارسی کلام کی تزئین و آرائش میں گزرا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں فارسی زبان سے بے حد لگاؤ تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے فارسی کلام پر نازاں تھے تو یہ بات بھی غلط نہیں۔ جیسے اُس کی زندگی کو نماز و روزے سے کوئی نسبت نہ تھی بالکل یہی کیفیت اُس کے اُردو کلام کی رہی کہ آج تک اہلِ علم اُس کے اُردو کلام میں نعتیہ اشعار تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اُس کا اُردو غزل کا ایک نعتیہ مطلع ملاحظہ فرمائیے:

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی　　　قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

تصوف سے متعلق اُس کا ایک نکتہ نظر تھا۔ اُس کے خطوط اور فارسی کلام بھی دین کے اثرات کا عکاس ہے۔ غالب نے کمال ہُنر مندی سے اللہ کی تجلی اور کائنات کے ظہور پر بات کی ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے وجود پاک کو اِس ظہور کا سبب قرار دیا ہے۔ ایک اور خوب صورت فکر کا حامل شعر دیکھیے:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

یہاں اُس نے ایک عاشقِ صادق کی طرح بات کی ہے اور جنّت کی معنویت ہی بدل دی ہے کہ تمام تر نعمتوں اور راحتوں کا وجود اپنی جگہ۔ اُس سے کسی کو انکار نہیں مگر شاعر کی نظر میں '' جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی '' والی کیفیت ہے۔ اُس کے لیے جنت کا تصور جنت میں تب متشکل ہوگا جب وہ محبوب کی جلوہ گاہ بھی قرار پا جائے۔ سبحان اللہ دیدار اور حضوری کی تڑپ، عشق و محبت کا دل میں موج زن سمندر حضور کی ذاتِ عالی مرتبت سے بے پایاں عقیدت کا ثبوت ہے۔ شعر میں لہجہ دعائیہ اپنایا گیا ہے۔ کائنات کے مالک سے ایک التجا بھی ہے کہ کاش وہ اعلیٰ ترین جگہ محمد ﷺ کی زیارت کا وسیلہ بھی ہو۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　　کہ غیر جلوۂ گُل، رہ گزر میں گرد نہیں

اِس شعر میں حضور اکرم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا ذکر کس عمدہ انداز میں کیا گیا ہے۔ '' بہشت شمائل '' کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ غالب ہی کا ذہن رسا ہو سکتا تھا کہ اُس ہستی کے لیے بہشت شمائل کے الفاظ استعمال کیے جو کسی اور ہستی کو زیبا نہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا کہنا ہے کہ '' یہ رہ گزر تاریخ اور زندگی کی رہ گزر ہے۔ '' جلوۂ گُل '' میں اُس صبحِ سعادت آثار کی تمام کیفیت سمٹ آئی ہے ورنہ تاریخ کی رہ گزر جلوۂ گُل اور خاک دونوں کا بہ یک وقت نظارہ پیش کرتی رہی ہے ''

اُس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

اِس شعر میں کئی فنی و فکری خوبیاں پنہاں ہیں۔ اہلِ نظر چاہیں تو اِس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ شعر ایک خوب صورت تلمیح بھی ہے کہ واقعہ معراج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پھر حضور کی عظمت کو کس انداز سے واضح کیا گیا ہے کہ آسمان کو گنبدِ بے در کہا جو کسی عظیم ہستی کے لیے کھل سکتا ہے کسی عامی کی بساط کہاں اور سب سے بڑی بات یہ کہ محسنِ انسانیت سے وابستگی پر ایقان و ایمان۔ اُن کی نسبتیں دونوں جہانوں میں بے کسوں کا سہارا ہیں۔ روزِ محشر وہ شافع محشر ہوں گے تو اِس دنیا کے آلام و مصائب اور مشکلات میں اسمِ محمد کی برکتیں سب بگڑے کام بنا دیتی ہیں، شاعر کا بھی اس بات پر ایمان ہے اور اسے اس نسبت پر فخر ہے جس کا وہ اظہار کر رہا ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کا امتی ہوں مشکلات میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ میرے سب بگڑے کام سنور کے رہیں گے کہ میں اُن کا ادنیٰ

امتی ہوں جو کسی بے کس کو بے سہارا نہیں چھوڑتے۔

حالی وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ ''یادگارِ غالب'' میں اپنے استاد کی فارسی شاعری کی اہمیت پر زور دیا اور اُسے خسرو اور بیدل کے بعد ہندوستان میں فارسی کا آخری بڑا صاحبِ کمال شاعر اور انشاپرداز قرار دیا۔ غالب کے فارسی دیوان کا معاملہ اُردو زبان کے دیوان سے اس اعتبار سے قطعی مختلف ہے کہ اُس میں با قاعدہ نعتیں ملتی ہیں۔ غالب نے اِس کا آغاز ایک لاجواب حمدیہ غزل سے کیا جس کا انداز اگرچہ شکایت آمیز ہے مگر اُس کو خدا کی ذات سے بڑی امیدیں بھی وابستہ ہیں۔ حمد کی طرح اُس نے اپنے فارسی کلام کو ایک نعت سے بھی آراستہ کیا ہے۔ اِس نعت کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ مطلع ملاحظہ کیجیے:

حق جلوہ گرز طرزِ بیانِ محمد است　　　آرے کلامِ حق بزبانِ محمد است

ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کو معجزات عطا کر کے دنیا میں بھیجا تھا اس لیے کہ منکرین اُن سے معجزات کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے۔ اللہ کے آخری نبی کا زندہ معجزہ اللہ کا کلام قرآنِ حکیم ہے۔ خالقِ ارض وسما نے خود اِس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اِس اعجاز سے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں بتا دیا گیا ہے۔ قیامت تک امتداد زمانہ اس پر اثر نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے واحد برگزیدہ پیغمبر تھے جو خالق دو جہاں سے ہم کلام ہوتے تھے لہٰذا کلیم اللہ کہلائے۔ اُن کو احکامات الواح پر درج کر کے دیئے گئے۔ جب کہ قرآن پہلے رسول اللہ ﷺ کے قلبِ اطہر پر وارد ہوا، پھر زبان سے ادا ہوا اور صحابہ کرام نے دلوں میں محفوظ کر لیا۔ بعد ازاں قرطاس پر منتقل کیا۔ اللہ کا کلام نہ صرف حضور کی زبان مبارک سے ادا ہوا بلکہ آپ نے نمونۂ عمل بن کر اہلِ عالم کو اُس کی حقانیت کا ثبوت دیا۔ مختصر یہ کہ حقیقتِ حق کی پہچان محمد ﷺ کے بیان سے ہوتی ہے۔ نبی جی کی زبان سے نکلنے والی ہر بات اظہارِ حق ہے، اللہ کی بات ہے۔ اِس لیے کہ آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ ہر بات خدائے برحق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس نعت کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

آئینہ دار پرتو مہر است آفتاب　　　شانِ حق آشکار، زشانِ محمد است

یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ چاند دراصل سورج ہی کی روشنی کو منعکس کر رہا ہوتا ہے۔ وہ سورج کی روشنی سے چمکتا اور خوب صورت نظر آتا ہے۔ عین اُسی طرح کائنات کے حاکم، خالق اور مالک کا جلال و جمال، محمد ﷺ کی شان سے ہویدا ہے یعنی اللہ پاک اپنی ذات وصفات کی تمام صفات کی جمال آرائی خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں کرتا ہے۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکش حق است　　　اما کشاد آں زکمانِ محمد است

غالبؔ کی عملی زندگی جیسی بھی تھی، فی الوقت اسے ایک طرف رکھیے اور اُس کے مذکورہ بالا شعر کی معنویت، فکری تازگی، خیال کی ندرت پر غور کیجیے۔ مقام محمد ﷺ کو جس طرح غالب نے جانا اور پرکھا ہے اُس کی داد دیجیے اور عش عش کر اٹھیے۔

شانِ عبدیت کا اظہار ملاحظہ کیجیے کہ اللہ اور بندے کی رضا ایک ہوگئی ہے۔ اللہ کی اطاعت نبی کی اطاعت میں مضمر ہے اس لیے کہ آپ ہی اللہ کے سب سے اطاعت گزار بندے ہیں۔ آنحضرت کی محبت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا۔ قضا و قدر، مقدر، نصیب، راحت، مسرت، بخشش، رحمت، مغفرت اللہ کے ترکش میں کیا کچھ نہیں ہے مگر یہ سارے فیضان کے تیر اپنی منزل پر محمدﷺ کی کمان ہی سے پہنچتے ہیں۔ سارے فیضان انسانیت تک حضور کے وسیلے سے پہنچتے ہیں۔ غالب نے تیر، ترکش اور کمان کے استعاروں سے جس طرح آقا کی بزرگی، بڑائی اور فضیلت بیان کی ہے وہ غالب ہی کی پروازِ فکر کا کمال ہے۔ اُس نے مقام و مرتبۂ نبوت کو جس طرح سمجھا اور اپنے فارسی کلام میں بیان کیا اُس کی نظیر نہیں ملتی۔

ایک حدیث پاک میں مقصدِ تخلیقِ کائنات واضح کیا گیا ہے "لولاک لما خلقت الافلاک" اب اس حدیث کو ذہن میں رکھتے ہوئے غالب کی زیرِ نظر غزلیہ نعت کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

دانی اگر بہ معنی لولاک داری　　　　کز ہر چہ از حق است ازانِ محمد است

تمام کائنات نبی اکرم کے حسن و جمال کی خاطر سجائی گئی ہے تو اس میں جو بھی دل پذیر اور جہاں آرا مظاہر ہیں وہ بھی آپ ﷺ ہی کی محبوبیت کی نشانی ہیں۔ یعنی اللہ کریم اپنی شان کا اظہار محمدﷺ کی صورت میں کرتا ہے۔ آپ صاحبِ لولاک اور روحِ کُن فکاں ہیں۔ اسی نعت میں افضل البشر کی محبوبیت کا ایک اور رنگ دیکھیے:

ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد　　　　سوگند کردگار بجانِ محمد است

یہ دنیاوی چلن بھی ہے کہ لوگ اپنے معاملات میں اُس ہی کی قسم کھاتے ہیں جو انہیں عزیز ترین ہوتا ہے۔ پس اندازہ کر لیجیے کہ جس کی قسم قرآن میں اللہ رب العزت نے کھائی ہے وہ خالق و مالکِ کائنات کو کتنا عزیز ہے۔ حضرت ابنِ عبّاسؓ فرماتے ہیں کہ حضور پاک نبی اکرمﷺ سے زیادہ اللہ کریم کی نظر میں کوئی مکرم و محترم نہیں ہے اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی زندگی کی اللہ نے قسم کھائی ہو۔

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فروگزار　　　　کاینجا سخن زسرورِ روانِ محمد است

شاعر کہتا ہے کہ واعظ کو طوبیٰ کا ذکر چھوڑ دینا چاہیے کہ آج "سرِ روانِ محمد" کا تذکرہ ہے۔ اس شعر میں گویا حضور کے سراپا، آپ کے قد و قامت کی دل کشی اور جاذبیت کو موضوع بنایا گیا ہے کہ آپ کے مقابل جنت کا درخت طوبیٰ اور دنیا کے سرو و صنوبر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ شارحین نے کیا عمدہ بات کی ہے کہ طوبیٰ خوب صورت سایہ دار درخت ہے۔ ہمارے نبی آخرالزماں سایہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کے تپتے ریگستانوں میں ہر بے کس اور لاچار کے لیے ٹھنڈے سائبان کی طرح ہیں۔

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را　　　　کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمد است

اِس شعر میں ادبی لطافت کے ساتھ تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر نے شق القمر کا محیر العقول واقعہ بیان کر کے شعر کو تاریخ سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ آپ کی انگشتِ مبارک کی نیم جنبش کا نتیجہ تھا کہ ماہ تمام دولخت ہو گیا۔ اُس واقعہ کو مکہ میں مقامی افراد کے علاوہ باہر سے آنے والے قافلوں نے بھی دیکھا۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ اگر چاند دولخت ہو سکتا ہے تو ایک دن زمین و آسمان کو بھی الٹ دیا جائے گا۔ یہ بساط سمیٹ لی جائے گی۔

درخورِ زنفس مہرِ نبوت سخن رود　　آں نیز نامور ز نشان محمد است

آپ کے جسمِ اطہر پر ایک ایسا نشان تھا جو آپ ہی کے لیے خاص تھا، اُسے مہرِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس شعر میں اُسی نشان یعنی مہرِ نبوت کا ذکر ہے کہ وہ درحقیقت آپ ہی کی ذات سے نسبت کی وجہ سے نام ور اور بلند مقام ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے مہرِ نبوت کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں مونڈھوں کے درمیان میں دیکھا۔ جو سرخ رسولی جیسی اور مقدار میں کبوتر کے انڈے جیسی''۔ وہ مہرِ نبوت ہو یا کوئی اور چیز یا شخص، جو جو بھی حضور کے حلقے میں آیا۔ آپ سے نسبت قائم ہوئی تو دنیا و دیں میں سرفراز ہوا۔

اسی وجہ سے اِس غزلیہ نعت کے مقطع میں غالب نے کمال بات کہہ دی ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ حضور آقا کی ثنا بیان کر سکے۔ تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام سرکنڈے قلم میں تبدیل ہو جائیں تب بھی محمد کی م کے اوصاف بیان نہیں کیے جا سکتے کہ کوئی انسان آپ کے مقام و مرتبے کے شایانِ شان الفاظ اور فکر تلاش ہی نہیں کر سکتا۔ ہم آپ کی تعریف بیان تو کرتے ہیں کہ یہ آپ سے محبت وعقیدت کا تقاضا ہے مگر یہ ایسے ہی ہے کہ ایک معمولی کم تر بے نور ذرّہ اٹھ کر مہرِ جہاں تاب کے اوصاف بیان کرنے لگے۔ سوا کچھ نہیں۔

اے خاک درت　قبلۂ جان و دل غالب　　کز فیض تو پیرایۂ ہستیت جہاں را

اِس شعر کا کمال یہ بھی ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص مقطعے کی بجائے اس شعر میں استعمال کیا ہے کہ یہاں خیال وفکر کا تقاضا یہی تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ آپ کا در غالب کے لیے قبلۂ جان و دل ہے۔ یہ خوب صورت ترکیب بھی شعر کا حاصل ہے اور تری ہستی دنیا کے باغ کی آرائش کا سبب ہے۔ غزل کا اختتام شفاعت کی فکر کا حامل نعتیہ شعر سے کیا گیا ہے۔ اِس یقین اور امید کا اظہار کیا ہے کہ آپ اپنے کسی امتی کو ہمیشہ کے لیے نارِ جہنم میں نہیں رہنے دیں گے۔ غالب کے فارسی دیوان کا آغاز حمد سے ہوتا ہے پھر غزلیہ نعت اور اُس کے بعد کی غزل کا اختتامیہ نعت پر۔ اِس کے علاوہ ایک مکمل، مشہور اور مقبول نعت بھی شامل ہے۔ غالب کی نعتیہ فکر کو اگر دو تین الفاظ میں سمیٹا جائے تو اُس میں مقامِ رسالت کی عظمت کا بیان ہے۔ اسی عظمت کا ایک پہلو حضور کی شفاعت ہے۔ میرزا عملی طور پر عبادات سے دور سہی مگر وہ ایک موحد تھا۔ اللہ، اُس کے رسول اور آلِ عبا سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اُس کا ایقان تھا

کہ حضور شافع محشر بن کر روزِ قیامت ہم گنہ گاروں کا سہارا بنیں گے، اس لیے حضور کا کوئی امتی دوزخ کی آگ میں نہیں جلے گا۔ آپ کی امت پر دوزخ حرام ہے:

برامتِ تو دوزخ جاوید حرام است　　　حاشا کہ شفاعت نہ کئی سوختگاں را

غالب کے فارسی دیوان میں تین نعتیہ مثنویات بھی ہیں۔ غالب کی مختصر ترین مثنوی میں ۱۵۷ اشعار ہیں۔ پہلا شعر بہ عنوان ''ایزدای کلک قدسی صریر، بہر جنبش از غیب نیر د پذیر''۔ شاعر نے اِس مثنوی میں بہت خوب صورتی سے درود شریف کو دیباچۂ نعت قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ سب سے پہلے اللہ کریم، پھر اُس کے فرشتے اور پھر مومنین حضور اکرم ﷺ کی ذات پاک پر درود بھیجتے ہیں۔

درودے بہ عنوان دفتر نویس　　　بہ دیباچہ نعت پیمبر نویس

مذکورہ مثنوی میں تلمیحات کے ذریعے واقعہ معراج اور اُس کی عظمت کو کمال انداز سے واضح کیا گیا ہے۔

دوسری مثنوی میں ۱۲۰ ابیات ہیں اور اُس کا عنوان ہے ''بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نورالانوار حضرت الوہیت ست'' اِس کا موضوع آپ ﷺ کا رحمت اللعالمین، خاتم الانبیا اور متقدم الزماں ہونا ہے۔ شاعر نے اِس میں محمد مصطفےٰ ﷺ سے مدد طلب کرنے کو اللہ ہی سے مدد طلب کرنا قرار دیا ہے۔ مزید براں اس میں حضور کے نور ہونے کو کئی طرح سے بیان کیا ہے۔ دو اشعار درج کیے جاتے ہیں:

جلوۂ اوّل کہ حق برخویش کرد　　　مشعل از نور محمد ﷺ پیش کرد

شد عیاں زاں نور در بزمِ ظہور　　　ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور

اور تیسری ۲۸۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اُس کا عنوان ہی ''معراج'' ہے اور یوں ظاہر ہے کہ یہ واقعہ معراج سے متعلق ہے۔ نعتیہ مثنویات میں یہ طویل ہے۔

نگویم کہ یزداں ترا عاشق ست　　　ولے زاں طرف جذبۂ صادق ست

کہ اے ذرۂ گردِ راہ تو من　　　ز خود رفتہ جلوہ گاہِ تو من

غالب کے کل ۶۴ قصائد میں سے اڑھائی نعتیہ ہیں یعنی دو مکمل اور ایک نعت و منقبت میں مشترک۔ دیگر میں ایک حمدیہ، ۸ منقبتی اور باقی، سلاطین، نوابین اور امرا سے متعلق ہیں۔ نعتیہ قصائد میں سے پہلا ۱۶۵ اشعار پر مشتمل ہے، دوسرے میں ۱۰۰ اشعار اور مشترک قصیدے میں ۵۵ اشعار ہیں۔ اُس کی نعت گوئی کا کمال یہ بھی ہے کہ وفورِ شوق و عقیدت اپنی جگہ مگر جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دیا کہ عبد و معبود کا فرق مٹ جائے اور بات شرک کی حدود میں داخل ہو جائے۔ وہ ثنائے رسول عربی ﷺ بیان کرتے ہوئے اکثر مقامات پر یہ ضرور کہتا ہے کہ کہاں میں اور کہاں مدحتِ خیر البشر۔ یہ کام تو خالقِ انس و جاں ہی کو زیبا ہے:

ہر چند شوق تشنۂ عرضِ عقیدت ست   اما تو و ستایشِ ممدوحِ کردگار

سطحی فکر رکھنے والے ناقدین کا خیال ہے کہ کلام میں تلمیحات کا استعمال شعریت کو مجروح کرتا ہے۔ غالب نے جس طرح اپنے کلام میں تلمیحات کو برتا ہے وہ ایک طرف تو اُن کی روایت سے آگاہی اور دوسری طرف ہُنر مندی کا ثبوت ہے کہ برجستگی اور روانی میں فرق نہیں آیا۔ مزید براں اشعار کو علمی اور تاریخی پس منظر اور معنویت عطا ہوئی ہے۔ غالب کے فارسی اور اُردو کلام میں کئی ایک ایسی تلمیحات ملتی ہیں جن کا تعلق وحدانیت، عشقِ رسول ﷺ اور حبِ علی کرم اللہ وجہہ سے ہے۔ مثلاً ''اولیں دورِ امامت اور وصی ختم رسل'' مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مرزا کا مذہب تو صلح کل تھا مگر زیادہ تر میلانِ طبع تشیع کی طرف تھا پایا جاتا ہے اور حضرت علیؓ کو حضور ﷺ کی ذات کے بعد کل عالم میں افضل ترین خیال کرتے ہیں''۔ اولین دور امامت سے مراد حضرت علیؓ کا دور ہے جن کو وہ وصی رسول اور جانشینِ رسول اور پہلا امام مانتے تھے۔ ''آل عبا'' سے مُراد اہلِ عبا ہے یعنہ خاندان کے وہ افراد جن کو سرورِ عالم نے اپنی عبا میں لے کر آیۂ تطہیر پڑھا تھا اور اپنی اولاد ہونے کی تصدیق کی تھی۔ ''بوتراب'' جب آنحضرت نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تا کہ مہاجرین کا بوجھ کسی ایک یا چند افراد پر نہ پڑے تو ایک مہاجر کو ایک انصار کا بھائی بنایا مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کسی کا بھائی قرار نہ دیا جس پر وہ اُداس ہو گئے اور مسجد نبوی کے کچے فرش پر جا کر لیٹ گئے۔ ہوا چلنے اور گرد اڑنے سے آپ بھی مٹی سے آلودہ ہو گئے۔ اس کیفیت میں آپ کو نیند بھی آ گئی۔ حضور تشریف لائے اور انہیں عربی میں کہا ''قم یا ابا تراب: اٹھ اے مٹی کے باپ''۔ حضرت علیؓ بیدار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے اُن سے کہا کہ تجھے اس لیے کسی کا بھائی نہیں بنایا کہ تو میرا بھائی ہے۔ ''ذوالفقارِ شہِ مرداں'' یہ اُس تلوار کو کہتے ہیں جو غزوۂ بدر میں حضور کو عاص بن منبہ سے ہاتھ آئی تھی۔ ایک روایت تو یہ ہے جو زیادہ مشہور ہے کہ اِس کی دو زبانیں تھیں، قدیم عرب میں ایسی تلواروں کا بھی رواج تھا۔ دوسری کم مشہور روایت یہ بھی ہے کہ اُس پر مہرہ ہائے پشت از گردن تا کمر کی مانند نشان تھے، اس لیے اِس کو ''سیف مفقر'' بھی کہتے ہیں۔ حضور نے یہ تلوار حضرت علیؓ کو بخش دی تھی۔ اس تلوار کے فضائل احادیث میں موجود ہیں۔ ''ساقیِ کوثر ، موجِ کوثر ، شرابِ طہور'' کوثر کے لغوی معنی کثرت اور بہتات کے ہیں۔ نہر کوثر کو ''نہرِ محمدؐ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ آپ ﷺ کی ذاتی ملکیت ہے۔ آپ جنتیوں میں اپنے دستِ مبارک سے آبِ کوثر تقسیم فرمائیں گے۔ اُس لیے آپ کو ساقیِ کوثر بھی کہا جاتا ہے۔ ''صاحبِ قرآنی'' کا مطلب ہے طویل حکم رانی کرنے والا۔ خوش بخت و عالی مرتبت۔ جب دو ستارے زہرہ و مشتری ایک ہی برج میں جمع ہوں تو یہ ''قرآن السعدین'' کہلاتا ہے جو مدت بعد ہوتا ہے اور بہت مبارک اور نیک فال سمجھا جاتا ہے۔ اِس قرآن السعدین میں اگر کوئی پیدا ہوتا ہے تو بہت خوش بخت کہلاتا ہے کہ یہ موقع صدیوں بعد آتا ہے۔ بعض عالم حضرات کا خیال ہے کہ حضور اکرم ﷺ بھی قرآن السعدین میں پیدا ہوئے تھے۔ ''طوبیٰ و سدرہ'' یہ دو درختوں کے نام ہیں۔ ایک جنت کا اور ایک عرش کا درخت ہے۔ سدرہ کی شاخیں ساتویں آسمان سے آگے تک

پھیلی ہوئی ہیں، حضور کے سوا کسی اور نبی یا فرشتے کا اس مقام سے آگے گزر نہیں ہوا۔ ''محبِ چار یار'' حضور پاک کے چار یار سے مراد چار خلفائے راشدین ہیں۔ ''وصفِ دُلدُل رشۂِ دُلدُل سوار'' دُل دُل حضور کی مرغوب سواری تھی۔ یہ خچری حاکمِ اسکندر یہ نے حضور کی خدمت میں پیش کی تھی آپ ﷺ نے اکثر غزوات میں اُس پر سواری کی۔

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کیا کم ہے　　غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے
تم کرو صاحبِ قرانی جب تلک ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا
وصفِ دُل دُل سے مرے مطلعِ ثانی کی بہار　　نت نقشِ قدم سے ہوں میں اُس کے گلچیں
کب تلک پھیرے اسدلب ہائے تفتہ پر زباں　　تابِ عرض تشنگی اسے ساقیِ کوثر نہیں

وضع میں گو ہوئی دو سر تیغ ہے ذوالفقار ایک اُردو نعت گوئی کی یہ خوب صورت روایت رہی ہے کہ نعت گو ممتاز و نامور شعراً کی غزلیات کے مصرع ہائے طرح منتخب کر کے اُس پر نعتیں کہتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی مکمل غزل کو زمین قرار دے کر اُس پر نعت کہتے ہیں۔ غالب اِس حوالے سے خوش بخت ہے کہ اگر چہ اُس کے اُردو دیوان میں کوئی باقاعدہ نعت شامل نہیں مگر قدر دانوں نے غالب کی جدت، پروازِ تخیل اور ندرتِ افکار کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا کہ کسی نے اُس کی زمین میں ایک نعت کہی کسی نے ۶۳، کسی نے ۹۲ اور کسی نے تو اُس کے مکمل دیوان ہی کو نعت گو کی نظر سے دیکھا۔ انفرادی نعتوں کا تو شمار مشکل ہوگا۔ بہر حال یہ سعادت بھی اُس کا حصہ ہی کہی جاسکتی ہے۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور اُس کے کلام کی تازہ کاری کی وجہ سے اُس میں امکانات تلاش کیے جا رہے ہیں۔ یہ جستجو اُس کے اُردو دیوان میں گزرتے وقت کے ساتھ نئی روح پھونکتی جا رہی ہے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سب سے پہلے اُس کی زمین میں نعت کے پھول کھلانے کا اعزاز کس نعت گو کے حصے میں آیا مگر محققین کی نظر میں اُس کی زمینوں میں پہلا مکمل مجموعۂ کلام ساجد اسدی کا ''پیامبرِ مغفرت'' تھا۔ کتاب کے نام سے سن اشاعت ۱۹۷۵ء بھی نکلتا ہے۔ وہ سادہ اور رواں اسلوب میں نعت کہتے ہیں اور کلام میں عشقِ رسول ﷺ کا گداز بھی واضح ہے۔ راغب مُراد آبادی برصغیر کے ممتاز عروض دان، ماہرِ لسانیات اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ اُن کے فنی کمالات کا احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہیں۔ وہ چوں کہ زبان اور فن پر اعلیٰ ترین دسترس رکھتے تھے اِس لیے اُن کی نعتیں بہترین مضامین سے آراستہ ہیں۔ اُنہوں نے رسول اکرم ﷺ کی ظاہری طبعی عمر کے اعتبار سے غالب کی ۶۳ غزلیات کی زمینوں میں نعتیں کہی ہیں۔ مجموعۂ کلام ''مدحتِ خیرالشر'' ۱۹۷۹ء میں سفینہ اکیڈمی کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اُن کا ایک غیر منقوط نعتیہ مجموعۂ کلام ''مدح رسول'' بھی اشاعت پذیر ہوا تھا۔ علاوہ ازیں بدرالدجیٰ اور بہ حضور خاتم الانبیا بھی اُن کے اہم نعتیہ مجموعے ہیں۔ منظوم سفر نامہ حجاز بھی شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے نعتیہ کلام کا اختصاص یہ بھی تھا کہ نعتوں کے آخر پر قرآنی آیات کے حوالے موجود ہوتے تھے۔ ابرار کرتپوری کا غالب کی زمینوں میں

نعتیہ مجموعہ ''مدحت'' ۱۹۹۲ء میں غالب اکیڈمی دہلی سے شائع ہوا جس میں کل ۹۲ نعتیں شامل تھیں۔اُن کی نعتوں میں حضور کے مکارمِ اخلاق،تعلیمات،فضائل،علم انسانیت پر احسانات اوراثرات کا بیان ہے۔عقیدت کی سرشاری صداقت شعاری کے ساتھ نمایاں ہے۔ایاز صدیقی الفاظ کے چناؤ اور لفظی تراکیب کے استعمال سے کلام میں تہ داری پیدا کرتے ہیں۔اُن کا رشتہ روایت سے بھی خاصا مستحکم معلوم ہوتا ہے کیوں کہ فکر واسلوب میں روایت سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اُن کا نعتیہ مجموعہ جس میں غالب کی ۹۲ غزلیات کی زمینوں سے استفادہ کیا گیا تھا ۱۹۹۳ء میں روحانی آرٹ پریس ملتان سے شائع ہوا تھا۔بشیر حسین ناظم بھی ہمارے قریب کے عہد کے نام ور نعت گو ہیں۔انہیں فارسی وعربی زبانوں پر خاصی دسترس تھی جس کی وجہ سے وہ ارادۃً اپنے نعتیہ کلام میں عربی لفظیات کا کثرت سے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔اِس سے ایک فائدہ یہ تو ہوتا ہے کہ نعت گوئی کی لغت ثروت مند ہوتی ہے کہ بہت سے معاصر نعت گویوں نے فکر واسلوب کے اعتبار سے نعت کا دائرہ محدود کر رکھا ہے مگر اِس سے کئی مقامات پر کلام کی فصاحت اور روانی متاثر ہوتی ہے۔شعریت مجروح ہوتی ہے۔نسبتاً کم آمیز گجرات میں مقیم نعت گو شاعر ڈاکٹر افتخار الحق ارقم بھی عربی زبان پر دسترس کا یوں فائدہ اٹھاتے ہیں کہ کلام میں عربی لفظیات کا عمدہ استعمال نظر آتا ہے۔نعت کی لغت ثروت مند ہوتی ہے۔ اُن کا نعتیہ مجموعہ کلام ''مدحِ محمودؐ'' ماورا پبلشر لاہور سے زیرِ طبع ہے۔ بہر حال یہاں بات غالب کی زمینوں کی ہے۔جس میں بشیر حسین ناظم کا مجموعۂ کلام ''جمالِ جہاں افروز'' ۱۹۹۸ء میں فریدیہ پرنٹنگ پریس کراچی سے شائع ہوا۔اِس میں غالب کے تمام دیوان کی زمینوں میں نعتِ رسول ﷺ کے پھول کھلائے گئے تھے۔اِن صاحبانِ فکر ونظر کے علاوہ بھی کئی احباب مثلاً امریکا میں مقیم امان خان دل کا غالب کی زمینوں میں نعتیہ کلام ''شہ لولاک'' ۲۰۰۶ء میں نعت ریسرچ سنٹر کراچی سے شائع ہوا۔ سیّد نور الحسن نور نے میر تقی میر (نعتوں کے دیے) کے علاوہ غالب کی زمینوں میں (ثنا کی نکہتیں) بھی اپنا نعتیہ مجموعہ کلام مرتب کیا ہے۔نور اپنے اسلوبِ بیاں اور مضامین کے اعتبار سے روایت سے زیادہ پیوستہ نظر آتے ہیں۔مذکورہ نعت گویوں کے غالب کی ایک زمین میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے درخشاں ایک پہلو یہ مری تقدیر کا
واسطہ ہے اُن کی رحمت سے مری تقدیر کا

(ساجد اسدی)

مدحتِ خیر البشر اعجاز ہے تحریر کا
یہ بھی اک انداز ہے قرآن کی تفسیر کا

(راغب مُراد آبادی)

آیئے اب چاند تاروں پر کمندیں ڈال دیں
آیۂ قرآں میں ہم کو حکم ہے تسخیر کا

(ابرارکرتپوری)

آہ غم دل سے اٹھی اور بابِ رحمت کھل گیا
میں نے دیکھا ہے یہ منظر آہ کی تاثیر کا

(ایازصدیقی)

غلغلہ ہے ہر طرف اُس حسنِ عالم گیر کا
مصدر و مطلع ہے جو آفاق کی تنویر کا

(بشیرحسین ناظم)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں ایک وید اور دوسری دیوانِ غالبؔ
ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

تفہیم غالبؔ کے مسائل اور ہمارا عہد

شمیم حنفی

یہ بات کہی تو تھی میرؔ صاحب نے کہ "سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا، ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے۔" لیکن میرؔ سے زیادہ یہ قول غالب پر صادق آتا ہے۔ غالبؔ اپنے زمانے کے ایک چیلنج تھے، ہمارے لیے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں مشکل گوئی کا الزام کسی اور بڑے شاعر پر عائد نہیں کیا گیا۔ کسی نے اپنے افکار اور اسالیب بیان کی سطح پر اتنے اعتراضات کا سامنا نہیں کیا، جتنا کہ غالبؔ نے۔ شاعری جیسی بے ضرر سرگرمی کے باعث کسی کی اتنی مخالف نہیں ہوئی، جتنی کہ غالبؔ کی۔ ناصر کاظمی نے میرؔ کی بابت یہ کہا تھا کہ ہر بڑا شاعر اپنے بعد بہت سے قبیلے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر اسکے کلام کا یا سوانح کا جو بھی حصہ کسی کے ہاتھ لگا، وہ اسے لے کر بھاگتا ہے۔ اس کی تعبیر اتنے مختلف پیرایوں سے اور اتنی متضاد سطحوں پر کی جاتی ہے کہ تعبیر کی کثرت میں حقیقت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم تک اگر کچھ پہنچتا ہے تو ایک ادھوری سچائی، ایک جزوی حقیقت، تصویر کا ایک نقطہ یا صرف ایک لکیر۔ پھر محقق ہو یا نقاد، اسی ایک لکیر کو پیٹنے میں عمر گزار دیتا ہے۔

غالب جس دنیا کے باسی تھے، اس دنیا سے غالب کا تعلق ٹوٹے ہوئے بھی آج (2005ء) ایک سو چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ گویا کہ کائنات کا، انسانی وجود کا، وقت کا اور حقیقت کا جو تصور غالب رکھتے تھے، وہ ایک صدی سے زیادہ پرانا ہو چکا ہے کہ غالبؔ نے جس ذخیرۂ الفاظ سے کام لیا اور اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا، وہ ہمارے عہد تک پہنچتے پہنچتے متروک تو نہیں ہوا ہے، مگر زیادہ مقبول بھی نہیں ہے۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنے والے، ان کے اپنے زمانے میں بھی بس اکاّ دکاّ ہی رہے ہوں گے۔ ہمارے زمانے کے بھی گنتی کے کچھ شاعروں نے ان کی روش اختیار کی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں صرف دو نئے شاعروں کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو نئی نظم کے سب سے معروف شاعروں میں شامل، افضال احمد سید ہیں جنہوں نے "چھینی ہوئی تاریخ" کی نثری نظموں سے اپنے سفر کی شروعات کی اور طرزِ احساس کے رنگا رنگ تجربوں سے ہوتے ہوئے، اپنی غزلوں کے دیوان "خیمۂ خواب" تک پہنچے۔ افضال احمد سید کی غزلوں کا انداز حسب ذیل ہے۔

کیا ساعتِ مسعود تھی جس وقت مرا دل
طرزِ سخنِ میرزا نوشاہ پہ آیا

غالبؔ کی تقلید نے افضال احمد سید کی غزلوں میں جو رنگ بکھیرے ہیں، ان کی کچھ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

اُس شوخ کے ترکش کا میں وہ تیرِ خطا ہوں
جو لوٹ کے پھر اس کی کمیں گاہ پہ آیا

اک عکس چاہیے ہے سرشیشۂ شکست
وہ عکس، بے ارادہ و تدبیر چاہیے

رات اک خیمۂ غم آتشِ خاموش پہ تھا
کچھ ہوائے خنک آثار عنایت کرنے

بہ نوک تیز ہے میرا نوشتۂ تقدیر
کہ مجھ سے ممکن و موہوم میں خلل آیا

سرابِ عمر سے اک جست میں گزر جاؤں
صلاح رمز شناسانِ خاک و آب سے ہے

اب لطف مجھے ماتم رفتہ سے زیادہ
بربادی آئندہ و امروز میں آیا

ان شعروں پر ایک گہری وجودی صورتحال کا سایہ ہے، انسانی تجربوں اور واردات کی وہ نوعیت، جسے پہلی عالمی جنگ (1914ء) کے بعد یورپ میں پنپنے کا موقع ملا اور ہماری ادبی روایت میں جسے ترقی پسند تحریک کی کہولت اور پژمردگی کے دور میں قبولیت ملی۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ اشعار بظاہر روایتی آہنگ اور اسلوب رکھتے ہوئے بھی ہمیں نئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی رونما ہوتی ہے کہ نئے تخلیقی تجربے صرف نئی لفظیات کے پابند نہیں ہوتے۔ اصل مرحلہ ہوتا ہے پرانے لفظوں میں

ایک نئے اندرونی ربط اور نئے تلازموں کی دریافت کا۔ اپنے دور میں غالب نے بھی یہ کیا تھا اور بیسویں صدی میں مستحکم ہونے والے نئے میلانات کی ترویج کرنے والے نئے شاعروں نے بھی یہی کیا۔ یہ مسئلہ ایک علیحدہ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ سردست، میں اس سے گریز کا راستہ اپناتا ہوں اور موجودہ زمانے میں غالبؔ سے اپنی حسیت کا تعلق قائم کرنے والے ایک اور شاعر سرمد صہبائی کے کچھ شعر نقل کرتا ہوں۔ یہاں یہ یاد دلاتا چلوں کہ سرمدؔ صہبائی ایک مجنونانہ تخلیقی استعداد رکھنے کے باوجود، اپنے شعری اظہار کے معاملے میں بہت کفایت شعار رہے ہیں۔ ان کی نظم "تیسرے پہر کی دستک" اپنے اشتعال انگیز آہنگ اور اپنے وسیع ادراک کے باعث جدید سے مابعد جدید تک، نئی نظم کے کسی بھی آئندہ انتخاب میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ برسوں کی خاموشی کے بعد پچھلے دنوں انہوں نے کچھ غزلیں کہی ہیں اور انداز و اسلوب وہی اختیار کیا ہے جو غالب سے منسوب ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر سنیے:

عرصۂ خواب میں ہوں ہوش سے رخصت ہے مجھے گردشِ
ایام و سحر ساغرِ غفلت ہے مجھے

اک مری لغزشِ پا سے ہے زمانے کو خرام
نغمۂ شہرِ سخن وقفۂ لکنت ہے مجھے

کیوں ہو تنہائی میسر تجھے اے دل کہ جہاں
خود مرا سایہ بھی ہنگامۂ کثرت ہے مجھے

رونقِ باغِ عدم ہے مرے مرنے کا خمار
لذتِ آب فنا وعدۂ جنت ہے مجھے

اس خم زلف سے کھلتا ہے مقدر میرا
ظلمتِ چشم سیہ مطلعِ قسمت ہے مجھے

بے خبر رکھتا ہے یک رنگیِ عالم سے مجھے
اک تصور جو ترا موسمِ حیرت ہے مجھے

بسترِ درد بچھاتا ہوں تو نیند آتی ہے
زیرِ سرسنگِ جنوں بالشِ راحت ہے مجھے

جلوۂ دار دکھاتا ہے مجھے نخلِ بہار
غمزۂ لالہ و گل سنگِ ملامت ہے مجھے

بس کہ بیماری جاں میں بھی میں آرام سے ہوں
آمدِ شام بلا عیدِ عیادت ہے مجھے

منتِ مرگ ہو کیوں تو ہی بتا شامِ فراق
جب کہ ہر روز یونہی مرنے کی عادت ہے مجھے

جب سے لا حاصلِ جاں حاصلِ جاں ٹھہرا ہے
تنگیِ فکرِ فراواں سے فراغت ہے مجھے

غزوۂ ہجر کی اس معرکہ آرائی میں
گوہرِ اشک درِ زخمِ غنیمت ہے مجھے

کیوں معاصر نہ ہو وہ غالبؔ آشفتہ مرا
میں ہوں پوشیدہ ولی کفر سے نسبت ہے مجھے

جلسۂ رسمِ سخن عام ہے لیکن سرمدؔ
اس کی آواز کہن لہجۂ جدّت ہے مجھے

میں چند شعر نقل کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے پوری غزل ہی آپ کو سنا ڈالی۔ یہ معاملہ بھی بھلا اردو کے اور کس شاعر کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر دور میں اسے اس طرح اپنا معاصر تسلیم کر لیا جائے۔ غالبؔ کی انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ اپنے تجربوں اور احساسات کو، لفظوں اور بیان کو، ایک خاص پہچان دینے کے باوجود، وہ اپنے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں بننے دیتی۔ نہ وقت کی، نہ مقام کی، نہ فکر کی، نہ جذبے کی، نہ زبان کی، نہ بیان کی۔ دو چار شعر تو پرانے سے پرانے شاعر کے یہاں ایسے مل جائیں گے جن میں ہم اپنی ہستی یا اپنے زمانے کا عکس ڈھونڈ نکالیں۔ اس میں دیسی بدیسی کی بھی کوئی قید نہیں۔ ہر زبان اور ہر زمانے کی اداس اور پریشاں روحوں کو شاعری اسی طرح ایک میں یکجا کر دیتی ہے اور زبان، تہذیب، مسلک، عقیدے، زمانے کے اختلاف کے باوجود وہ آپس میں مکالمہ قائم کر لیتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ، سوداؔ، دردؔ، قائمؔ، نظیرؔ سے لے کر ہمارے اپنے دور تک، ایسے بہت سے شعروں، نظموں، غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو اس دور کے طرزِ احساس سے مناسبت رکھتی ہوں اور ہمارے اپنے تجربوں یا گرد و پیش کی حقیقتوں کی ترجمان کہی جا سکیں۔ لیکن غالب کے ساتھ تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں، اپنی ہزیمتوں اور اپنی کامرانیوں سمیت تمام و کمال ہمارے ساتھ آ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذہنی و جذباتی رفاقت کا رشتہ استوار کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگتی۔ ہر زمانہ، غالب کی شاعری میں اپنی ذہنی زندگی کے آثار دریافت کر لیتا ہے۔ ہر شخص غالب کو اپنے حساب سے پڑھتا ہے۔ اپنی تربیت اور ترجیحات کے مطابق ان سے معنی اخذ کر لیتا ہے۔

اور یہ صورت حال صرف اردو یا فارسی والوں سے مخصوص نہیں ہے۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہماری ادبی روایت سے شغف رکھنے والوں نے شاید سب سے زیادہ توجہ غالبؔ کی تفہیم و تعبیر اور ترجمے پر صرف کی ہے۔ اس ضمن میں، یہاں میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے چند لکھنے والوں کی مثال دوں گا۔ ان کے کچھ اقتباسات کی مدد سے، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ غالبؔ نے اپنی فکر اور فنی حکمت عملی یا تخلیقی حربوں کی وساطت سے، بہ ظاہر مختلف اور نامانوس زمانی، مکانی، ادبی اور تہذیبی پس منظر رکھنے

والے ادیبوں کے شعور میں بھی اپنی جگہ بنائی ہے۔ یہاں اپنی بات میں اشوک باجپئی کے ایک بیان سے شروع کرتا ہوں۔ یہ لفظ انہی کے ہیں۔(ترجمے کے ساتھ)

ہماری صورت حال، یعنی ہندوستانی صورت حال میں غالب پہلے جدید شاعر ہیں......تین معنوں میں وہ تجدد کے، وہ پہلے کلاسیک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے یہاں فرد شاعری کے مرکز میں موجود ہے۔ بغیر کسی استواری جہت، بغیر کسی روایتی آدرش اور ایقان کے......ایک نہتے انسان کی شکل میں۔ دوسری بات غالب کا استفہامیہ مزاج ہے، ہر بات پر وہ سوال قائم کرنے کی جرأت (رکھتے ہیں) وہ دنیا کے تماشے پر سوال، اپنے وقت پر سوال اُٹھاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں ہندی اور فارسی روایت کا ایک امتزاج، ایک معنی خیز باہمی ربط ملتا ہے۔ ہندی روایت کو غالبؔ کی شاعری میں ایک نئی زبان ملی......میرے پاس ایک مجموعہ ہے، دنیا کی مابعد الطبیعاتی شاعری کا......اس میں ہندوستان کے جو شاعر لیے گئے ہیں......ویدؔ اور اپنشدؔ کے علاوہ، ایک حصہ گیتا کا ہے۔ گوتم بدھ کے کچھ کتھن ہیں......اور پھر کبیرؔ، میرؔ اور غالبؔ۔

غالبؔ کے بعد اردو شاعری وہ کچھ نہیں رہی جو غالبؔ سے پہلے تھی۔ غالبؔ تاریخ کے نہیں، ابدیت کے شاعر ہیں اور ہمارے لیے وہ یوں بامعنی بنتے ہیں کہ ہم سے وہ ایک ہم عصر کی طرح مکالمہ قائم کرتے ہیں۔

غالبؔ انیسویں صدی میں نہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر تھے بلکہ دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں ہیں......اپنی نگاہ کے پھیلاؤ میں، اپنی نئی وضع کی فکر میں، اپنے فلسفیانہ استدلال اور کھرے پن میں، اپنی جسارت مندی میں، اپنی بے چینی اور پریشاں نظری میں، غالبؔ ایک بہت بڑی شخصیت کے طور پر اُبھرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی بڑی برادری کا حصہ ہیں جو ہمارے یہاں ویدؔ سے لے کر اب تک پھیلی ہوئی ہے۔

بات پھیلتی جا رہی ہے اس لیے اشوک باجپئی کے بیان کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور کچھ جملے ملیالم کے ممتاز شاعر اور ہندوستانی ادبیات کے معروف عالم سچدانندن کی گفتگو سے نقل کرتا ہوں۔ان کا کہنا ہے کہ:(ترجمے کے ساتھ)

''میں صرف ایک قاری ہوں۔میرا غالب سے اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کا پہلے کی صدی کے عظیم پیش رووٴں سے ہوسکتا ہے......اس طرح میں پاتا ہوں کہ وہ میرے اپنے ہم عصر ہیں، وہ مجھ سے ایک جدید شاعر کی طرح بات کرتے ہیں۔

جو سوال غالب نے اُٹھائے وہ فارسی، اردو شاعری سے وابستہ روایتی سوالوں سے بہت مختلف نہیں تھے۔عشق کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟......لیکن ان کے جواب مختلف ہیں۔ ان کے جواب انسانی رشتوں کی ایک نئی دستاویز سامنے لاتے ہیں۔ دنیاوی اور ماروائی عناصر ایک ساتھ ان کے یہاں اظہار پاتے ہیں۔انہیں ایک نئی زبان، ایک نئے شعری محاورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے زبان کے روایتی مذاق کو وہ قبول نہیں کرتے۔ایک ادیب کی حیثیت سے غالب کی عظمت یہی ہے کہ وہ ایک نیا محاورہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ مستقبل کی زبان گڑھ رہے ہیں۔طمانیت کے خاتمے اور تشکیک کا ایک نیا تجربہ اپنے اظہار کے لیے نئی زبان چاہتا تھا۔غالب نے شاعر کا روایتی رول اختیار کرنے سے انکار کیا ہے''۔

غالب کی شاعری اور شخصیت میں ایک مستقل تحرک کا اور زندہ انسانی عناصر کی شمولیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی شخصیت نئی بھی ہے، پرانی بھی۔اپنی مخصوص پہچان کی تابع بھی ہے اور اتنی وسیع بھی کہ ایک ساتھ بہت سے اور مختلف انسانی اوصاف کو، تضادات کو اپنے اندر جذب کرلے۔اسی طرح غالب کی شاعری، شاعر کے روایتی رول اور ایک روایتی معاشرے کے مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ نئی زندگی اور معاشرت کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔

ہم غالب کو اسی طرح پڑھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح اپنے آپ کو۔تمام خوش فہمیوں اور فریبوں سے، رسوم و روایات کی تمام بندشوں سے تمام، تمام مصلحتوں اور مجبوریوں سے آزادی کا اور مجبوری کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی وجودی خودمختاری کا ایسا اظہار ہمیں اردو کے کسی دوسرے بڑے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔غالب کی شاعری میں معنی کی تکثیر کے ساتھ ساتھ لفظ و بیان کا

امکانات کی رنگارنگی بھی بے مثال ہے۔ غالبؔ نے شعریات کے کسی جامد تصور کے سامنے نہ تو ہار مانی، نہ شعریات کا کوئی ایسا نظام وضع کرنے کی کوشش کی جس کے ضابطے متعین اور بے لوچ ہوں۔ لہٰذا کسی بندھے ٹکے اصول کے مطابق ان کی تفہیم وتعبیر بھی ممکن نہیں ہے۔ مرتّب فکر اور مرتّب زندگی کے اپنے فائدے بھی ہوتے ہیں۔ مگر ایسی فکر اور ایسی زندگی کی کچھ مجبوریاں، معذوریاں اور حدیں بھی ہوتی ہیں۔ غالبؔ نہ اپنے ماضی سے مرعوب تھے، نہ اپنے حال سے اتنے خوف زدہ کہ انہیں تلاش کو حوصلہ چھوڑ بیٹھتے۔ اس لیے انہوں نے نہ تو اپنے پیش رووں کی روایات پر تکیہ کیا، نہ اپنے عہد کی اطاعت قبول کی۔ زندہ رہنا ایک طرح کی بے بسی میں مبتلا ہونا سہی، مگر غالبؔ کی طبیعت کسی بھی مقدر کو بے چون وچرا قبول کر لینے پر آمادہ نہ تھی۔ سارترؔ کے ایک کردار (Reprieve کے میتھیوؔ) نے کہا تھا:

''ایک انسانی وجود کے لیے ''ہونے'' کا مطلب اپنے آپ کو منتخب کرنا (پہچاننا) ہے۔ اسے نہ تو اپنے خارج سے کچھ ملتا ہے، نہ اپنے اندرون سے، جسے وہ وصول یا قبول کر سکے۔ پس آزادی (بجائے خود) ہستی نہیں ہے۔ یہ انسان کی ہستی ہے یعنی (گردوپیش کی دنیا میں) نہ ہونا۔''

''اندرون (باطن) کچھ بھی نہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ میں کچھ نہیں۔ میں آزاد ہوں۔''

غالبؔ کا، ڈائلما بھی یہی ہے اور ان کی الجھن کا سبب بھی یہی ہے کہ خود کو آزاد سمجھیں یا گرفتار۔ یہ سوال ہر عہد کے سوچنے والے انسان کا آشوب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ اور زندگی کے تئیں ہر زاویۂ نظر غالبؔ سے اور تفہیم غالبؔ سے اپنا ایک الگ معاملہ رکھتا ہے۔ خود غالبؔ نے اپنی ذہنی کش مکش کی تعبیر یوں کی تھی کہ:

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
''عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴾......تنقیدی مضامین......﴿

محاسنِ مکاتیب غالبؔ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

مکتوب نگاری غالب کے مزاج کا جزوِ لاینفک معلوم ہوتی ہے جس کی اہمیت کا اظہار ان کے کلام میں بھی جا بجا ہوا ہے:

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب
مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

یہ ''ذوق خامہ فرسائی'' خطوط غالب کی فنی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بایں ہمہ غالب نے جب اُردو میں خط نگاری کا سلسلہ شروع کیا تو ابتدا میں کسی ادبی تخلیق یا نادر تحریر کا خیال اُن کے ذہن میں نہیں تھا۔ سیدھی سادی اردو نثر کے بارے میں اُن کے ذہن میں یہ خیال آ بھی کیسے سکتا تھا۔ انہیں تو ایک عرصے تک اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کی عظمت سے بھی انکار ہی رہا:

فارسی میں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

پھر ایک ایسے زمانے میں جب علما و فضلا اپنی نثری تحریریں ابھی فارسی ہی میں لکھ رہے تھے، غالب اپنی ''سادہ'' اردو تحریریں کیونکر ادبی دنیا کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔(۱) بہرحال زمانے کا فیصلہ زیادہ قوی اور اٹل ہوتا ہے۔ غالب کا اردو کلام اور اس سے بھی زیادہ ان کے اردو خطوط اپنے گوناگوں فکری و فنی محاسن کی بدولت ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ غالب کو یہ مقام فطری صلاحیتوں کے علاوہ فنی ارتقاء کی چند منزلیں طے کر کے حاصل ہوا۔

---

(۱) خطوط غالب کی طباعت کا سوال سب سے پہلے نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی ہرگوپال اور شیونرائن نے غالباً آپس میں صلاح مشورہ کر کے اُٹھایا۔ غالب نے اس اجازت طلبی پر جو سخت رویہ اختیار کیا، اس سے مذکورہ بالا بیان کی بہ خوبی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ان عزیزوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو، اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔'' (خط بنام ہرگوپال تفتہ، محررہ شنبہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء)

''اُردو کے خطوط کو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کہ لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا جانا میرے خلاف طبع ہے۔'' (خط بنام شیونرائن آرام، محررہ پنج شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

غالب ایک جدت پسند فنکار تھے۔ یہ اَنا کا شدید احساس اور جدت پسندی کا تقاضا ہی تھا جو انہیں تقلید سے اجتہاد کی طرف لے آیا اور پھر وہ فکر وفن کی اُن اچھوتی فضاؤں تک پہنچے جہاں عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے شعر وسخن کا آغاز متاثر شعرائے فارسی مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا جلال اسیر، شوکت بخاری وغیرہ کی پیروی میں کیا۔ انہوں نے طرزِ بیدل کی پیروی کا اعتراف ایک مقطعے میں یوں کیا ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

تقلید کی اس راہ پر کچھ عرصہ گام زن رہنے کے بعد وہ اس سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں جس کا اعتراف وہ اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دُور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے۔''

(خط بنام عبدالرزاق شاکر، خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر طبع لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۵۴۰)

مشق سخن کی ابتدائی منزلیں بڑی کٹھن اور صبر آزما تھیں۔ بعض معاصرین انہیں مہمل گو قرار دے رہے تھے، اور وہ بڑی شان استغنا سے اس قسم کے حملوں کو رد کر رہے تھے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن غالب اگر ایک طرف رومانی مزاج کے حامل تھے تو دوسری طرف ایک حقیقت پسند ذہن بھی رکھتے تھے۔ ان کی معاملہ شناسی اور حالات سے مفاہمت ومطابقت پیدا کر کے زندگی کو خوشگوار بنانے کا ثبوت اکثر خطوط سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں بھی انہیں اپنی پچھلی روش ترک کر کے عصری فنی تقاضوں کا پاس کرنا پڑا۔ اور پھر معنوی عظمت اور شوکت لفظی کے حسین امتزاج سے لے کر سادہ وسہل ممتنع انداز تک، انہوں نے فن شعر کا وہ ''تاج محل'' بنا کر پیش کیا کہ جس کی عظمت ورفعت کا اعتراف ہم عصروں نے بھی کیا، اور آنے والے زمانے کی گرویدگی تو مسلم ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانی پر اس حد تک فخر تھا کہ وہ اپنے پیش روں کے فارسی دانوں میں ماسوا امیر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے کسی کو درخور اعتنا خیال نہ کرتے تھے۔ یہی باعث تھا کہ وہ اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کو ''بے رنگ من است'' کہتے رہے۔ لیکن آخر انہیں اپنے اس رویے میں بھی لچک پیدا کرنی پڑی۔ اردو خطوط کے بارے میں کچھ اس سے بھی زیادہ نازک معاملہ پیش آیا۔ برعظیم میں اسلامی عہد میں علما کی زبان فارسی رہی اور غالب کے زمانے تک، اردو کے پھیلاؤ کے باوصف، علما اپنی نگارشات کے لیے فارسی ہی کا سہارا لے رہے تھے۔ پھر غالب جیسے ذہن وفکر کا آدمی کیونکر یہ روش خاص چھوڑ کر سیدھی سادی اور عوامی زبان کو منہ لگا سکتا تھا۔ ایک عرصے تک وہ فارسی ہی میں مکتوب نگاری کرتے رہے اور اس زبان میں انشا پردازی کے جوہر

دکھاتے رہے۔ پھر قدرتی طور پر ایک وقت ایسا آیا جب قویٰ جواب دینے لگے اور فرصت زندگی کم نظر آنے لگے۔ محنت مشقت کا وہ یارانہ رہا جو فارسی تحریروں کو عالمانہ شان سے پیش کر سکے۔ اس لیے ضرورت نے سیدھی سادی روزمرہ اردو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ غالب نے ایک حقیقت شناس اور معاملہ فہم انسان کی طرح اس تبدیلی سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ پھر جو روش مجبوری یا معذوری کے تحت اختیار کی گئی تھی، جب اسی میں غالب کی جدت پسند ادبی شخصیت کا بے ساختہ اظہار ہونے لگا اور اس کی حسن و خوبی آشکار ہوئی، تو آخر عمر میں، جب شعری تخلیق کے سوتے خشک ہو چکے تھے، یہی روش ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا سرچشمہ بن گئی۔ اس طرح شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی غالب کی عظمت فن کا ایک اور روشن مینار تعمیر ہوا۔

غالب کے جو خطوط اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان کے مطابق ان کی اردو خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی خطوط نویسی میں کمی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں (خاتمہ پنج آہنگ کی تحریر سے دو سال قبل) فارسی میں خطوط لکھنے ترک کر دیئے گئے۔ بعض لوگ فارسی میں خط لکھنے کا تقاضا کرتے تھے تو غالب معذرت کے ساتھ اردو میں خطوط نویسی کی وجوہ بتا دیتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط (محررہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء) میں لکھتے ہیں:

''برسوں سے خطوط فارسی لکھنا چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق اُن کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔'' (خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر، صفحہ ۶۵۱)

غالب کی اُردو خطوط نویسی کی ابتدا کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ مولانا حالی نے قلعۂ معلّٰی کے تعلق (۱۸۵۰ء) اور مصروفیات کو وجہ قرار دیا ہے۔ لیکن ۱۸۴۸ء کے اردو خطوط اس موقف کی تردید کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس امر میں خود غالب کے بیانات زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ ان بیانات سے اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے علاوہ فارسی میں اظہار کی دقتوں اور اردو میں اظہار کی سہولتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور پھر جب یہ باتیں غالب جیسا اپنی فارسی پر ناز کرنے والا شخص کہتا ہے تو اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اکتسابی زبان بہ ہر حال اکتسابی ہی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خواہ کتنی ہی مہارت بہم پہنچا لے، اسے فطری اور بلا تکلف طریق اظہار کا درجہ مشکل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ غالب کے وہ خطوط جن میں انہوں نے فارسی خطوط لکھنے کے بارے میں معذوری کا اظہار اور پھر اس کی وجوہ بیان کی ہیں، اس مسئلے کو بہ خوبی حل کر دیتے ہیں۔ عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضعف و ناتوانی کا احساس اور فارسی میں انشا پردازی کا معیار قائم رکھنے کے لیے بہ تکلف عبارت آرائی اور اس کے لیے محنت پژوہی و جگر کاوی، یہ وہ بنیادی اسباب تھے جو غالب کو سادہ اردو خطوط نویسی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

''افسوس کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ نواب صاحب، اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آ جائے وہ لکھ لوں، ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

(خط بنام انور الدولہ شفق، خطوط غالب، صفحہ ۳۶۳)

''بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی

ورزش میں گزرے۔اب جسم وجاں میں تاب وتواں نہیں۔نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔اُردو،سواس میں عبارت آرائی متروک۔
جوزبان پرآوے،وہ قلم سے نکلے۔پاؤں رکاب میں ہےاور ہاتھ باگ پر،کیا لکھوں اور کیا کہوں؟''

(خط بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی،نگاشتہ بست وسوم فروری ۱۸۵۷ء)

''بندہ نواز،فارسی میں خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔حرارت غریزی کوزوال ہےاور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئےقویٰ غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں،سب کو،جن سے خط وکتابت رہتی ہے،اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے مَیں نے فارسی زبان میں خطوط ومکاتیب لکھے اور بھیجے تھے،اُن میں جو صاحب الی الآن ذی حیات وموجود ہیں، اُن سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت ومراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔پارسی مکتوبوں،رسالوں،نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ،چھاپا ہو کر اطراف واقصائے عجم میں پھیل گئے۔حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے؟ جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر وتعلق وبار سے دست بردار وسبک دوش کر دیا۔جو نثریں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں،انہیں کو جناب احدیث جلت عظمتہ مقبول قلوب اہل سخن ومطبوع طبائع ارباب فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی وآلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔نظم ونثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا۔اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی وقائم رہے گا۔ پس اُمیدوار ہوں کہ انہیں نذ محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اُردو سے سادہ وسرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش وفرد ماندۂ کشاکش معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔اللہ بس ماسویٰ ہوس۔''

(خط بنام عبدالرزاق شاکر،خطوط غالب،صفحہ ۵۳۷)

غالب نے کاروباری اور معاملاتی ضرورتوں کے تحت اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اور سادگی سے مطلب نویسی پر مدار رکھا۔رفتہ رفتہ ان خطوط میں،جو خاص احباب اور شاگردوں کو لکھے گئے،جذباتی عنصر اظہار وبیان کے حسین نقوش بنانے لگا۔واقعۂ انقلاب (۱۸۵۷ء) سے پہلے غالب کے خطوط میں کاروباری معاملات کے علاوہ علمی مسائل اور ادبی خیالات کے اظہار نے اسلوب میں گونا گوں کیفیات پیدا کرنی شروع کر دی تھیں (۱)۔لیکن واقعۂ انقلاب کے بعد ان کے اردو خطوط میں ادبی لحاظ سے ایک عظیم تغیر پیدا ہوا،جس کے کچھ نفسیاتی محرکات تھے۔

---

(۱) مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے مندرجہ ذیل خطوط (بحوالہ خطوط غالب،از مہر) قابل ذکر ہیں: نشان۴ (جنوری ۱۸۵۲ء) نشان ۷ (جون ۱۸۵۲ء)،نشان ۸ (دسمبر ۱۸۵۲ء)،نشان ۱۴،نشان ۱۶،نشان ۱۸ (۲۱ اگست ۱۸۵۳ء)،نشان ۲۵ (۲ مارچ ۱۸۵۴ء)

واقعۂ انقلاب ایک ایسا حادثۂ عظیم تھا جس نے ملک کی اجتماعی زندگی کو بُری طرح متاثر کیا۔ انقلاب کے اسباب، واقعات اور اثرات تو تاریخ کا اہم حصہ ہیں لیکن غالب کی ذات پر اس کے جو اثرات پڑے وہ ادبی لحاظ سے بڑے دُوررس نتائج کے حامل تھے۔ غالب بقول حالی ایک حیوان ظریف تھے۔ اس نوع کا انسان مجلسی زندگی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ غالب بھی ایک مجلس پسند انسان تھے۔ وہ کثیر الاحباب تھے۔ واقعۂ انقلاب نے اس مجلسی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ انگریزوں نے سقوط دہلی کے بعد مسلمانوں کو خاص طور پر نشانۂ انتقام بنایا اور انہیں شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اور پھر ایک عرصے تک انہیں شہر بدر رکھا گیا(۱)۔

غالب اس ابتلائے عام سے محفوظ اور دہلی میں مقیم رہے(۱)۔

---

(۱) غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں اس کی تفصیل بتائی ہے:

''اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے، راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟''

(خطوط غالب، از مہر، صفحہ ۱۵۲)

(۱) غالب کے بعض خطوط میں ان واقعات کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔

''۔۔۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوہر پال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دِلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے، لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔''

(خط بنام تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ع، خطوط غالب، صفحہ ۱۵۲)

''مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔

(خط بنام تفتہ، ۵ مارچ ۱۸۵۸ع، خطوط غالب، صفحہ ۱۵۴)

''یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔''

(خط بنام میر مہدی مجروح، ۲ فروری ۱۸۵۹ع، خطوط غالب، صفحہ ۲۸۱)

''اے میری جان! یہ وہ دِلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دِلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دِلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دِلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کمپ ہے۔ مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔''

(خط بنام علاؤالدین علائی، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

لیکن ان کے عزیز احباب ان سے بچھڑ گئے۔غالب کے لیے یہ ایک طرح کی قید تنہائی تھی جس کا ان کے قلب وذہن پر بڑا شدید اثر ہوا، اور وہ اس عالم تنہائی میں بڑی گھٹن اور بے بسی محسوس کرنے لگے۔تنہائی کے اس تلخ احساس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے خطوط کا سہارا لیا۔ڈاک کا انتظام معقول ہو چکا تھا جس سے انکے اس رجحان کو تقویت ہوئی۔اس طرح غالب کی اردو خطوط نویسی کو ایک نئی فضا ملی۔اگر پہلے یہ خط زیادہ تر کاروبار دنیوی اور معاملات ضروری کی خاطر لکھے جاتے تھے، تو اب یہ خط کاروبار شوق اور تسکین دل کے لیے لکھے جانے لگے، اور خطوط نگاری کے ذریعے اُس مجلسی خلا کو پُر کیا جانے لگا جو واقعۂ انقلاب سے پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اب غالب کے خطوط محض نامہ نگاری کا وسیلہ نہیں رہے تھے بلکہ مجلس آرائی کا ذریعہ بن گئے تھے۔تنہائی کی خاموش فضا میں احباب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔(۲) یہ ملاقاتیں جسم وروح کی نہ سہی لیکن اس سے کچھ کم بھی نہ تھیں۔ان ملاقاتوں نے خطوط غالب میں وہ ادبی محاسن پیدا کیے جن کی بدولت غالب کا ادبی مقام (خطوط کے آئینے میں) نہ صرف اردو ادبیات میں بلکہ عالمی ادبیات میں بہت اونچا نظر آتا ہے۔

مجلسی فضا میں بے تکلف احباب کی جو غیر رسمی ملاقاتیں شب وروز ہوتی ہیں، وہ انسانی زندگی کی متاع عزیز ہیں۔ان ملاقاتوں میں احوال دل سے لے کر کوائف روزگار تک ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔اپنی کہتی جاتی ہے، دوسرے کی سنی جاتی ہے۔اس طرح دل کا بوجھ بہت حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔آلام روزگار کو سہنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔پھر انسان کی زندگی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنی عمر رفتہ کے بیتے ہوئے لمحوں پر نظر ڈالتا ہے تو ایک خواب وخیال کی طرح روداد حیات کی مختلف کڑیاں نظروں کے سامنے آنے لگتی ہیں۔اُس وقت انسان میں اپنی زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کی فطری خواہش پیدا ہوتی ہے۔آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا رجحان بھی عام طور پر اُس دور میں پیدا ہوتا ہے جب انسان شباب وشیب کی وادیوں سے گزر کر کہولت کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔آپ بیتی سنانے کی یہ فطری خواہش مجلسی ماحول ہی میں پوری ہو سکتی ہے۔

---

(۲) ''انصاف کرہ، کتان کثیر الاحباب آدمی تھا۔کوئی وقت ایسا نہ تھا میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔'' (خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۱۵۹)

''وہ ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب اُن کو خط لکھوں گا۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۱۶۰)

''بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔'' (ایضاً، صفحہ ۱۷۱)

''تم سمجھے؟ میں تمہارے، منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔'' (ایضاً، صفحہ ۱۷۴)

''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا''۔ (ایضاً، صفحہ ۱۷۹)

''مرزا صاحب، میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' (ایضاً، صفحہ ۲۲۷)

''بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت ومکالمت ہو گئی ہے۔روز باتیں کرتے ہیں۔'' (ایضاً، صفحہ ۲۷۰)

غالب کی اُردو خطوط نویسی کا سلسلہ بھی زندگی کے اسی مرحلے میں شروع ہوا۔ واقعۂ انقلاب کے بعد انہوں نے مجلسی ماحول سے محرومی کا مداوا خطوط سے کیا۔ ان محرکات نے اُن کے خطوط میں مراسلہ نگاری اور مکالمہ نگاری کے فاصلوں کو ختم کر دیا۔ وہ اپنے خطوط میں جو فضا قائم کرتے ہیں، اُس میں وہی کیفیات ملتی ہیں جو اس قسم کی شبانہ محفلوں میں عام طور پر ہوتی ہیں۔ خبریں سنانا، خبروں پر تبصرے، باتیں کرنا، مکالمے، شکوے شکائتیں، ماحول کی مرقع کشی، زندہ دلی کی فضا پیدا کرنے کے لیے لطیفے اور بذلہ سنجی، زندگی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار، آرزوؤں کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والے غم سے خود نباہ کرنا اور دوسروں کو بھی حوصلہ دلانا، غالب کے خطوط کی اہم خصوصیات ہیں اور انہی خصوصیات کے فن کارانہ اظہار نے اُن کے خطوط میں ادبی محاسن کو اُجاگر کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

خطوط غالب کے فنی وادبی محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو بہر حال ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ غالب خط کو خط سمجھ کر ہی لکھ رہے تھے۔ اسے داستان، آپ بیتی، انشائیہ، افسانہ یا ڈراما سمجھ کر نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے اُن کے خطوط میں کاروباری اور معاملاتی اُمور بھی ہوتے ہیں اور علمی مسائل پر بحثیں بھی ملتی ہیں۔ خطوط کے اس حصے کو ادبی محاسن کے اعتبار سے نہیں بلکہ اُسلوب نگارش کے اس پہلو سے دیکھا جا سکتا ہے کہ غالب نے ان مسائل ومعاملات کے بیان میں سادہ سلیس نثر کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ قافیوں کا استعمال، جو خطوط غالب کی ایک اہم خصوصیت ہے، اس قسم کے موقعوں پر عموماً نہیں ہوتا۔ اس لیے اس حصے کو ہم علمی نثر کہہ سکتے ہیں۔

دوسری بات جو اس جائزے کے سلسلے میں قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ غالب کے خطوط مختلف اصحاب کے نام لکھے گئے، اصولاً خط کی تحریر و ترسیل میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے خط کا لب ولہجہ آغاز سے اختتام تک متعین ہوتا ہے۔ جذباتی عنصر عام طور پر انہی خطوط میں مل سکتا ہے۔ جو ایسے اشخاص کو لکھے جاتے ہیں جن کے ساتھ انسان بے تکلفی سے دل کی بات کر سکتا ہے۔ ادبی لحاظ سے غالب کے وہ خطوط زیادہ اہم ہیں، جو بے تکلف احباب اور عزیز ترین شاگردوں کو لکھے گئے۔

القاب وآداب:

غالب نے خطوط نویسی کے قدیم انداز کو، جسے وہ ''محمد شاہی روشیں'' کہہ کر پکارتے ہیں، یکسر بدل دیا۔ اس تبدیلی کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب وآداب کے استعمال ہی سے ہو جاتا ہے۔ غالب اس بارے میں انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

''پیرومرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ مَیں القاب وآداب نہیں لکھتا۔''

(خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۳۶۲)

مکتوب نگاری کا جو نیا انداز غالب نے اختیار کیا تھا اُس میں رسمی القاب وآداب کی گنجائش میں نہیں تھی۔ تاہم غالب نے فرق مراتب کو بہرحال ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا اندازہ مختلف مکتوب الیہوں کے نام خطوط کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں مراسم کی نوعیت اس کی اجازت دیتی ہے۔ جہاں ادب واحترام واجب ہوتا ہے، وہاں القاب میں کلمات احترام آ جاتے ہیں۔ مثلاً خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام خطوط میں: پیرومرشد، قبلہ، قبلہ حاجات، جناب عالی، حضور، حضرت پیرومرشد، بندہ پرور وغیرہ، انورالدولہ شفق کے نام خطوط میں: پیرومرشد، قبلہ وکعبہ، خداوند نعمت، جناب بھائی صاحب قبلہ، نواب امین الدین احمد خاں کے لیے برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان وغیرہ اور جہاں تعلقات میں زیادہ یگانگت نہیں ہوتی وہاں القابات میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت، مخدوم ومکرم، جناب عالی، صاحب وغیرہ۔ اب ذرا بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں القابات کی جدت وندرت ملاحظہ فرمایئے:

علاؤالدین احمد خاں علائی:

''میرزا نسیمی کو دعا پہنچے، صاحب، مولانا نسیمی، میری جان، میری جان علائی ہمہ دان، جان غالب، علائی مولائی، مرزا علائی، یار بھتیجے گویا بھائی مولانا علائی! خدا کی دہائی، میاں، اقبال نشانا، جانا عالی شانا، جانا جانا، اے میری جان، اجی مولانا علائی وغیرہ۔''

منشی ہرگوپال تفتہ:

مہاراج، بھائی، شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ سلامت رہیں، بندہ پرور، کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ، صاحب، منشی صاحب، جان من و جانان من، میرزا تفتہ، نور نظر ولخت جگر مرزا تفتہ، برخودار، مشفق میرے کرم فرما میرے، اجی مرزا تفتہ، کیوں صاحب، دیکھو صاحب، میاں، میری جان، برخوردار مرزا تفتہ، میاں مرزا تفتہ، صاحب بندہ، حضرت، نور چشم غالب، از خود رفتہ مرزا تفتہ، آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو، میرے مہربان، میری جان میرزا تفتہ سخندان (بیشتر خطوط بغیر القاب کے شروع ہوتے ہیں)۔

مرزا حاتم بیگ مہر:

بندہ پرور، صاحب میرے، بھائی صاحب، بندہ پرور، شفیق بالتحقیق مولانا مہر ذرۂ بے مقدار کا سلام قبول کریں، مرزا صاحب۔

میر مہدی مجروح:

میاں، صاحب، کیوں یاد کیا کہنے ہو؟ سید صاحب، بھائی، میری جان، میر مہدی، میاں لڑکے، آہاہاہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا، جان غالب، لو صاحب، او میاں سید زادۂ آزادہ دتی کے عاشق دلدادہ، جو یائے حال دہلی والو رسلام لو، نور چشم مہر مہدی، آیئے جناب مہر مہدی صاحب دہلوی بہت دنوں میں آئے۔کہاں تھے؟ برخوردار کامگار میر مہدی۔

باتیں کرنا، مکالمے، خبریں سنانا:

القاب وآداب کی اس بے تکلفی کے ساتھ ہی دوسرا اہم پہلو، جس نے خطوط غالب کو ادبی لحاظ سے دلکش و دلچسپ بنایا ہے، وہ باتیں کرنے کا انداز ہے۔ہم اس کے نفسیاتی محرکات پر پہلے گفتگو کر آئے ہیں۔ادبی اسلوب میں باتوں کے انداز میں جو اپنایت، یگانت اور بے تکلفی ہوتی ہے، وہ کسی اور انداز بیان میں نہیں ہوتی۔میر تقی میر کو بھی اپنے اس انداز خاص کی دلکشی کا پورا احساس تھا:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا
پڑھتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

غالب خطوط کے ذریعے جس مجلسی ماحول کو پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ اس انداز نگارش سے ممکن تھا۔انہوں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مراسلے کو مکالمے کی جو صورت دی اُس میں مکالمے (Dialogue) بھی ہیں اور بات چیت کی مجلسی کیفیت بھی:

''بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب اُن کو خط لکھوں گا۔'' (خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر، صفحہ ۱۶۰)

''اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھے باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔'' (خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر، صفحہ ۲۸۶)

''اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔خط کو سر نامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔''

(ایضاً۔۔صفحہ ۳۶۱)

''اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا، زیادہ کیا لکھوں۔''

(ایضاً۔۔صفحہ ۳۸۱)

باتیں کرنے کے اس انداز سے نثر میں زندگی کا احساس بیدار رہتا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی جیتے جاگتے ماحول

میں بیٹھا ہے جہاں احباب باہمد گر مصروف گفتگو ہیں۔اس میں حرف وحکایت بھی ہے اور شکوہ وشکایت بھی۔ باتیں کرنے اور سننے والے کے درمیان اتنا قرب ہوتا ہے کہ وہ باتوں کے علاوہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں بھی سن سکتے ہیں۔اسلوب میں انداز سے باہمی اعتماد اور رفاقت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اُس میں معمولی سے لے کر غیر معمولی باتیں تک یکساں توجہ سے سنی جاتی ہیں اور انسان اُن میں لطف لینے لگتا ہے۔اسلوب کا یہی انداز ہے جو انشائیہ نگاری (Essay) کے لیے نہایت ضروری ہوتا ہے۔اُردو میں انشائیہ کی صنف غالب کے بعد سرسید کے زمانے میں ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء سے ظہور میں آئی۔لیکن اس صنف ادب کے لیے غالب کے اسلوب گفتگو نے زمین پہلے ہموار کر دی تھی۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں گفتگو کو مزید جاندار اور پُر لطف بنانے کے لیے مکالموں کو بھی جگہ دی ہے۔غالب کے مکالمے بڑے مختصر اور برجستہ ہوتے ہیں اور جو بات بیانیہ یا وضاحتی انداز میں ذرا طویل اور بے کیف ہو سکتی تھی، وہ مکالموں میں بڑی مختصر، جامع اور دلکش بن گئی ہے۔بعض مکالموں نے تو ایسا سماں پیدا کر دیا ہے کہ اُن کی وجہ سے متعلقہ خطوط ادبی لحاظ سے ضرب المثل بن گئے ہیں۔مثلاً:

(۱) (غالب): کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو!

لو صاحب، وہ آئے!

(غالب): میاں، میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے، مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو!

(خط بنام یوسف مرزا، خطوط غالب، صفحہ ۴۰۴)

(۲) (غالب): بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟

(محمد علی): حضرت، ابھی نہیں!

(غالب): کیا آج نہ جائیں گی؟

(محمد علی): آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے!

(خط بنام علاء الدین علائی، خطوط غالب، صفحہ ۶۹)

(۳) (غالب): تم خوب ہو!

(پیر جی): کیا کہنا!

(غالب): کس کا؟

(پیر جی): مرزا شمشاد علی بیگ کا!

(غالب): ایں، اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے؟

(پیر جی): واہ صاحب! مَیں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے!

(غالب): ہاں صاحب، آپ ایسے ہی وضعدار ہیں، اس میں کیا ریب ہے!

(خط بنام علاالدین خان علائی، خطوط غالب، صفحہ ۹۱)

اور غالب کا شاہکار مکالمہ تو مندرجہ ذیل ہے جس میں مکتوب الیہ میر مہدی مجروح ہیں لیکن مکالمہ میرن صاحب سے ہو رہا ہے۔ کتنا برجستہ، لطیف اور دلچسپ انداز ہے:

(۴) (غالب): اے میرن صاحب، السلام علیکم!

(میرن): حضرت آداب!

(غالب): کہو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

(میرن): حضور مَیں کیا منع کرتا ہوں؟ مَیں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ مَیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر تکلیف کیوں کریں؟

(غالب): نہیں، میرن صاحب! اُس کے خط کو آتے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

(میرن): حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

(غالب): بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

(میرن): سبحان اللہ، اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

(غالب): اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ مَیں میر مہدی کو خط لکھوں؟

(میرن): کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو مَیں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو مَیں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ مَیں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

(غالب): میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ مَیں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں

آ گیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔''

اردو کے افسانوی ادب میں ناول اور ڈرامے کی اصناف بھی غالب کے بعد ظہور میں آئیں۔ لیکن خطوط غالب کے یہ پیرایہ ہائے بیان ان اصناف ادب کے لیے اظہار و بیان کی راہیں تیار کر گئے۔

مکالموں اور باتوں کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی کا ایک اہم پہلو خبریں سنانے کا ہے۔ خبریں اور خبروں پر تبصرے ایک معاشرتی جبلت ہے جس کی تکمیل احباب کی شبانہ مجلسوں میں ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس کے ذریعے مجلسی فضا پیدا کر کے اپنی اور احباب کی تسکین دل کا سامان پیدا کیا ہے:

''آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۵۷)

''ہم تمہارے اخبار نویس ہین اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ۔۔۔۔'' (ایضاً، صفحہ ۱۸۳)

''میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ اِدھر آؤ خبریں سنو!۔'' (ایضاً، صفحہ ۲۹۵)

خبریں سننے سنانے کی اس معاشرتی حِس نے جہاں غالب کے خطوط میں مجلسی رنگ کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ وہاں ان کے خطوط تاریخی لحاظ سے بھی بہت اہم دستاویز بن گئے ہیں۔ غالب نہ صحافی تھے نہ مورخ، لیکن وہ احباب کی خاطر وقائع نویس بھی بنے اور صحیفہ نگار بھی، اور اس طرح اپنے خطوط میں عصری تاریخ کا بہت سا قیمتی مواد چھوڑ گئے۔ غالب نے ایک نہایت اہم اور ہنگامہ خیز دور میں اپنے احباب کو خطوط لکھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شہر بدر احباب کے تقاضوں کے تحت انہیں ''سوانح لیل و نہار'' بھی لکھنے پڑے۔ قدرتی طور پر وہ خطوط میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کی بعض ایسی تفصیلات بھی پیش کر جاتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ واقعات و حالات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ردعمل اور تاثرات بھی قلم بند کر جاتے ہیں۔ اس طرح غالب کے خطوط کا یہ سرمایہ رپورتاژ کی ذیل میں آجاتا ہے جسے ادب میں ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

خطوط غالب میں بیان کردہ معاصر واقعات و حالات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کر کے ان کی تاریخی حیثیت متعین کی جا سکتی ہے۔ غالب تک اطلاعات یا خبریں مختلف ذرائع سے پہنچتی تھیں۔ وہ ان کا عقلی تجزیہ بھی ضرور کرتے ہوں گے۔ خبر اور افواہ میں فرق ان کے پیش نظر رہتا ہے:

''خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دِلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی، سوسارے شہر میں مشہور ہے کہ۔۔''
(خطوط غالب، صفحہ ۲۸۰)

اس طرح غالب نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے وہ

بعض معمولی معمولی اُمور کا تذکرہ بھی کر جاتے ہیں۔ یہ معمولی باتیں آج کے محقق کو اُس دور کی عمرانی زندگی کے بعید گوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ دلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے کوائف، خاص و عام کی گزراوقات، معاشی حالات، سفر کے ذرائع اور حالات، ڈاک کے انتظامات، موسمی تغیرات وغیرہ (۱) یہ وہ مختلف اُمور ہیں جو خطوط کی مجلسی فضا سے اُبھر کر اس عہد کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

منظر نگاری اور مرقع کشی:

غالب خط لکھتے وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلسی فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ماحول کا تاثر دینے کے لیے خط کے شروع یا اختتام پر غالب گرد و پیش کے منظر کی ایسی جزئیات پیش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ اور قاری کی نگاہوں کے سامنے اس فضا کا دلکش مرقع اُبھرنے لگتا ہے۔ ادب میں مرقع کشی کے لیے بڑے سلیقے اور ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حقیقی جزئیات جو کسی موقع کی صورتحال کو اُجاگر کر سکیں اور پھر ان جزئیات میں ایسی ترتیب کہ کوئی بات زائد از ضرورت محسوس نہ ہو، بلکہ ہر معمولی اور غیر معمولی چیز حسن ترتیب سے یکجا ہو کر ایک مجموعی کیفیت پیدا کر دے، ایک ادبی مرقعے کی بنیادی شرائط ہیں۔ مرقع کشی کے لیے تخیل سے زیادہ مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرقع وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی ماحول کی خیالی باتیں نہ ہوں بلکہ حقیقی جزئیات ہوں۔ غالب کے خطوط میں منظر کشی اور مرقع نگاری اس لحاظ سے بڑی جاندار ہے کہ وہ ماحول کی خیالی تصویروں کے بجائے حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) مثلاً میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں یہ تفصیلات ملاحظہ فرمایئے:

''پنسن سب کو سراسر ششماہی ملنے کا حکم ہو گیا۔ ہر مہینے میں سودی لو اور کھاؤ۔ کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔ چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں، مگر صاف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ گیہوں، چنا، باجرہ تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں۔ نو سیر ساڑھے نو سیر۔۔۔۔''

(صبح چہار شنبہ، نہم جنوری ۱۸۶۱ء، خطوط غالب، صفحہ ۲۹۹)

وہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے اپنے گرد وپیش کی جزئیات سے ایسے مرقعے تیار کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری اس ماحول کا پورا احساس کرنے اور محظوظ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً یہ مناظر اور مواقع دیکھیے (۱)۔

---

(۱) ''رات کو خوب مینہ برسا ہے، صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمہاری جدۂ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانہ لوہارو ہوں۔ کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اسکی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سر راہ ہے۔'' (خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۶۸، ۶۹)

''ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے مَیں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔''

(خطوط غالب، صفحہ ۱۱۷)

''میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں، آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۲۹۴)

''اہاہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۲۹۵)

''کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۲۹۷)

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۳۱۲)

آپ بیتی:

غالب کے سوانح حیات کے سلسلے میں حالی کی یادگار سے لے کر موجودہ زمانے تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ حیات غالب کے مصادر میں ان کے خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ خطوط میں ان کے بارے میں بہت سی باتیں مل جاتی ہیں، بلکہ اس لیے کہ غالب نے اپنے خطوط میں آپ بیتی کے انداز میں خود اپنی سرگزشت کے بہت سے اوراق پیش کر دیئے ہیں۔ آپ بیتی سوانح عمری کی وہ شاخ ہے جس کا موضوع لکھنے والے کی اپنی زندگی کے لیل ونہار ہوتا ہے۔ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ انسانی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان کے دل میں فطری طور پر کچھ اپنے بارے میں، گزری ہوئی زندگی کے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں، کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک تو سوانح نگار ہی جا سکتا ہے۔ تاہم آپ بیتی نگار بھی اپنی روداد حیات اور ذہنی وجذباتی کیفیات اس وقت تک بیان کر سکتا ہے جب تک دم میں دم ہوتا ہے اور دست و قلم بالکل شل نہیں ہو جاتے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب باقاعدہ آپ بیتی یا سرگزشت نہیں لکھ رہے تھے، صرف احباب کے نام خط لکھ رہے تھے۔ البتہ یہ خطوط جس مجلسی ماحول کی بازیافت کے لیے لکھے جا رہے تھے اس میں دیگر احوال وکوائف کے علاوہ مجلسی زندگی کا یہ رجحان بھی پیدا ہوا کہ مکتوب نگار اپنے احباب کے سامنے اپنی بیتی زندگی کے تجربات ومشاہدات کی جھلک بھی پیش کرے۔ چنانچہ غالب نے مختلف خطوط میں اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے اور اس انداز سے لکھا ہے کہ اگر اس مواد کو سلیقے سے ترتیب دیا جائے تو اس سے غالب کی ایک آپ بیتی تیار ہو جاتی ہے (جیسا کہ بعض حضرات نے اس سلسلے میں کوشش بھی کی ہے)۔ اس آپ بیتی میں جیتا جاگتا غالب، اپنے غموں اور خوشیوں، اپنی آرزوؤں اور خواہشوں، اپنی محرومیوں اور شکستوں، اپنی احتیاجوں اور ضرورتوں، اپنی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کے ساتھ زندگی سے ہر صورت میں نباہ کرتا ہوا ملے گا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہ اوراق سرگزشت ایک ایسی شخصیت کے ہیں جو اَنا کا شدید احساس رکھنے کے باوجود اپنی احتیاجوں، اپنی کمزوریوں اور اپنی بدحواسیوں کا احتساب بھی کر سکتی ہے اور ان کا اظہار بھی (ا) آپ بیتی کا یہ وہ نازک مقام ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔

غالب اپنے خطوط میں مرتے دم تک اپنی ذہنی کیفیات کے نقشے اور بیتی ہوئی زندگی کے مرقعے پیش کرتے رہے۔ ان اُمور نے خطوط کی ادبی روح کو (آپ بیتی کے نقطہ نظر سے) بڑا دلچسپ اور دلکش بنا دیا ہے۔ اور ہم ان خطوط کے آئینے میں ایک ایسی آفاقی شخصیت کی جھلک دیکھتے ہیں جو زندگی کا ایک خاص مسرت بخش فلسفہ رکھتے ہوئے زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں سے نبرد آزما ہے۔ یہ عظیم شخص اپنی ناکامیوں اور محرومیوں پر کُڑھتا نہیں بلکہ ان پر استہزا کرتا ہے۔ وہ زندگی دلی اور خوش باشی سے جینے کی نئی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ غم والم کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتے ہوئے غم سے نباہ کی صورتیں پیدا کرتا ہے، شاعری میں بھی اور خطوط میں بھی۔ شاعری میں اگر وہ ایک مفکر بن کر جذبہ غم کا تجزیہ کرتا ہے تو خطوط میں زندہ دلی سے غم کے برداشت کرنے کا عملی ثبوت دیتا ہے، اور اس طرح ایک ایسے حوصلہ مند انسان کا نمونہ پیش کرتا ہے جو آلام روزگار کو نہ صرف اپنے لیے آسان بنا لیتا ہے بلکہ دوسروں میں بھی ضبط و برداشت اور حوصلہ مندی و زندہ دلی کے جذبات اُبھارتا ہے۔ جس انسان کا نظریۂ حیات یہ ہو:

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس کے ضبط و حوصلے کی انتہا کیا ہو سکتی ہے! خطوط غالب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ضبط و حوصلے کے یہ بندھن جب کبھی ٹوٹنے لگتے ہیں تو وہ نہایت زندہ دلی و شوخی سے پھر ان کو استوار کر کے سیلاب غم کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔

(ا) مثلاً قربان علی بیگ سالک کے نام خط میں یہ انداز ملاحظہ فرمائیے۔ خود احتسابی کی اس سے بہتر مثال ادب میں ملنی مشکل ہے:
''اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھ پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ مَیں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے ''جنت آرام گاہ'' و ''عرش نشین'' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آئیے نجم الدولہ بہادر!'' ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ مَیں ان سے پوچھ رہا ہوں: ''اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔'' بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۱۱۹)

خطوط غالب کی یہ مہماتی روح اور حیات بخش عناصر ایسے ہیں جو غالب کی آپ بیتی کو زندہ و تابندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور ہم اسے ایک غیر معمولی صلاحیتوں اور عظیم ذہن وفکر کے انسان کی سرگزشت سمجھ کر دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ حقیقت اور رومان کا امتزاج کبھی کبھی اس قسم کی کیفیات کا مرقع بن کر سامنے آتا ہے:

''میاں، تمہارے انتقالات ذہن نے مارا۔ مَیں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ مَیں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم وقدردان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور مَیں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سے راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر مَیں ابھی اس پایے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت وراحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بیرنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی وحافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہو گا؟'' (خطوط غالب، صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵)

زندگی کے بارے میں یہ فکر واحساس اگرچہ یاس انگیز ہے، مگر آفاقی سطح کا حامل ہے!

شوخی وظرافت:

غالب نے آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان زندہ رہنے اور زندگی کا احساس دلانے کی جو راہ تلاش کی، اُس میں شوخی و ظرافت کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سرچشمہ غم سے پھوٹنے والی ظرافت کوئی معمولی درجے کی ظرافت نہیں ہوا کرتی۔ اس میں زندگی کی حقیقتیں اور زندگی کے تضادوں سے پیدا ہونے والی بصیرتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ظرافت کی تخلیق کے لیے دل گرفتہ ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم ذہن وفکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب قلب وذہن کے اعتبار سے اُس مقام پر تھے جہاں اس قسم کی اعلیٰ ظرافت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ غالب کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا۔ محفلیں ویران ہوگئی تھیں۔ احباب بچھڑ گئے تھے۔ موت کی گرم بازاری نے ہر طرف افسردگی، یاس اور بے رونقی پھیلا دی تھی۔ اس افسردہ اور یاس انگیز ماحول میں بھی غالب نے خوش طبعی سے زندگی بسر کرنے کا جو ضابطۂ حیات اپنایا، اُس کو وہ اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے احباب کو بھی

اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اُجڑی محفل کی بے رونقی کا کچھ تو مداوا ہو جائے:

دل لگی کی آرزو بے چین رکھی ہے ہمیں

ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

''دل لگی'' کے اس رجحان نے اُن کے خطوط میں شوخی و ظرافت کی ایسی ایسی شگوفہ کاری کی ہے کہ غم کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان مسکرانے کی ہمت پیدا کر لیتا ہے۔ زندہ دلی سے جینے کا یہ قرینہ اُن مواقع پر خاص طور پر قابل دید ہوتا ہے جب غالب اپنے کسی آزردۂ خاطر دوست کو حزن و غم کے موقع پر خط لکھتے ہوئے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ زندگی میں موت ایک بہت بڑا حادثہ اور قدرتی طور پر غم کا باعث ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ موقع اُن احباب کی آزمائش کا ہوتا ہے جو غم کے اس موقعے پر تعزیت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سب طرف سے لاچار ہو کر رسمی جملوں اور پیرایوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن غالب کی زندہ دلی ایسے مواقع پر بھی جس طرح تعزیت جیسے رقت انگیز موضوع کو ظرافت کا عنوان بناتی اور غم زدہ انسان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا کرتی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ تعزیت کے دو مواقع ملاحظہ فرمائیے:

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ مَیں تیرے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟'' (خطوط غالب، صفحہ ۱۷۸)

''مرزا صاحب، ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں یک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔۔۔۔۔''

(خطوط غالب، صفحہ ۲۳۷)

تعزیت کے علاوہ شکوے اور خفگی کے موقع پر بھی وہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی تلخی محسوس نہیں کرتا، بلکہ محظوظ ہوتا ہے۔ شکوے میں بھی غالب نے اپنی جدت طبع کی بدولت ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے:

''فقیر شکوہ سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔'' (خطوط غالب، صفحہ ۲۱۹)

''کیوں صاحب، یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی

شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ آیا یہ اُمور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں؟'' (خطوط غالب، صفحہ۲۲۲)

''پیرو مرشد، بارہ بجے تھے، مَیں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ مَیں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کُرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو مَیں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ نقصان میرا ہوتا۔'' (خطوط غالب، صفحہ۳۶۶)

خطوط غالب کے ادبی محاسن کے سلسلے میں اور بھی کئی باتیں قابل ذکر ہیں۔ قدیم زمانے کی مقفیٰ و مسجع نثر تکلف اور اہتمام کی وجہ سے خاصی بدنام ہو چکی ہے۔ لیکن قافیوں کا التزام اگر بہ تکلف ہونے کی بجائے بے ساختہ ہو، تو ادبی نثر میں شعریت کا لطف و کیف پیدا ہو جاتا ہے۔ خطوط غالب میں گاہے بگاہے بے ساختہ قوافی اُن کی نثر میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں، صنعتوں، نادر تشبیہوں او رتمثیلوں کے ذریعے بھی وہ اپنی سادہ نثر میں رنگینی پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں، جو مجموعی طور پر خطوط کی دلکشی کا باعث ہیں، محاسن خطوط غالب کے سلسلے میں اضافی کہی جا سکتی ہیں۔ اصل حسن تحریر خطوط میں غالب کی ادبی شخصیت کے بے ساختہ اظہار کا ہے، جس کی گونا گوں کیفیات کا مجمل سا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہوا۔

محاسن خطوط غالب کو پیش کرنے کے سلسلے میں مغرب کے بعض نامور ادیبوں کی اسی نوع کی نگارشات سے موازنے کی صورت بھی ممکن ہے (جیسا کہ پہلے معمول رہا ہے) لیکن ہم یہ کام مغرب کے نقادوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ہاں کے نامور ادیبوں کی نگارشات کا غالب سے موازنہ کر کے اُن کی عظمت کا لوہا منوائیں!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالبؔ کے بارے میں ذوقؔ نے کہا تھا کہ مرزا نوشہ کو اپنے اچھے شعروں کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ بات تقریباً صحیح ہے۔ لیکن غالبؔ کو اپنے مافی الضمیر کی پوری خبر تھی۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے مافی الضمیر کو پوشیدہ رکھنے یعنی کیموفلاج کرنے کا بھی فن خوب آتا تھا۔

(شمس الرحمٰن فاروقی)

''مرزا غالبؔ فلم سازوں میں''

کلیم احسان بٹ

مرزا غالبؔ سے خوشہ چینی کرنے والے مزاح نگاروں میں ایک نام سید محمد جعفری کا بھی ہے۔سید محمد جعفری نے ۱۹۰۵ء میں ایک ایسے خانوادے میں آنکھ کھولی جس میں علم وفن اور شعر وادب کی روایت کئی پشتوں سے قائم تھی۔سید محمد جعفری کے والد سید محمد علی جعفری تاریخ اور فلسفہ کے ایم اے تھے۔انگریزی و فارسی ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔درس وتدریس ان کی زندگی کے محبوب مشغلے تھے۔دوسرے سماجی اور علمی کاموں خصوصاً انجمن حمایت اسلام لاہور کے مسائل کے حل میں بھی دل چسپی لیتے تھے۔ان کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کی پرنسپلی کے ساتھ شہر کی ساری علمی وادبی تحریکوں اور مشغلوں میں وہ شریک رہے اور عمر کا زیادہ حصہ علامہ اقبال اور ان کے معاصرین کی صحبت میں بسر ہوا۔

سید محمد جعفری کا مجموعہ کلام ''شوخیٔ تحریر'' مکتبہ دانیال کراچی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ کلام ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مختلف موضوعات پر ۵۸ نظمیں شامل ہیں۔نظموں کی ہیئت میں تنوع ہے۔غزل،مثنوی،مخمس،مسدس کی ہیئت زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

سید محمد جعفری کے کلام پر زیادہ اثرات غالبؔ اور اقبال کے نظر آتے ہیں۔اگرچہ انہوں نے اقبال کے کلام کی تحریف غالبؔ سے زیادہ کی ہے یا ان کی نظمیں اقبال کی مقبول نظموں اور اشعار کی زیادہ یاد دلاتی ہیں لیکن غالبؔ کے اثرات ان کے فکر وفن پر اقبال سے زیادہ ہیں۔ان اثرات کی نوعیت اور حدود کا اگر جائزہ لیا جائے تو لگتا ہے کہ سید محمد جعفری غالبؔ کے سحر میں گرفتار ہیں اور غالبؔ کے بغیر ان کی شاعری میں وہ شوخی پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو ''شوخیٔ تحریر'' میں موجود ہے۔

کتاب کا عنوان ''شوخیٔ تحریر'' غالبؔ کے دیوان کے پہلے شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کے پہلے مصرع سے اخذ کیا گیا ہے۔اس طرح ہم آغاز ہی میں یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ شاعر غالبؔ کی شوخی اپنے اشعار میں سمو کر لائے گا۔نظموں کی فہرست پر ایک نظر دوڑائیں تو ایک نظم ''مرزا غالبؔ فلم سازوں میں'' کے عنوان سے صفحہ ایک سو

پانچ پر موجود ہے جس میں غالبؔ بذات خود ایک کردار کی صورت میں موجود ہیں۔ غالبؔ کے ساتھ حیوان ظریف کی ترکیب کچھ ایسی چپکی ہے کہ اب ان کے کردار کو بھی بطور مزاحیہ کردار استعمال کیا جاسکتا ہے۔

''مرزا غالبؔ فلم سازوں میں'' مسدس کی ہیئت میں ہے۔ چھ چھ مصرعوں کے بندوں میں پہلے چار مصرعے آپس میں ہم قافیہ وہم ردیف ہیں اور آخری دو مصرعے باہم ہم قافیہ وہم ردیف ہیں۔ یہ نظم کل نو بندوں پر مشتمل ہے اور سوائے ایک بند کے ہر بند میں غالبؔ کے مصرعوں کا استعمال بے تکلفی سے کیا گیا ہے۔ بعض بندوں میں چھ میں سے تین مصرعے غالبؔ کے ہیں۔ اس نظم میں سید محمد جعفری نے نہ صرف غالبؔ کے مصرعوں کا استعمال کثرت سے کیا ہے بلکہ اس نظم میں غالبؔ بطور کردار موجود ہیں۔

سید محمد جعفری نے غالبؔ کے مصرعوں کو اس چابک دستی سے استعمال کیا ہے کہ نئے سیاق وسباق میں ان کے معانی میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً پہلے بند کے پانچویں اور چھٹے مصرعے کو دیکھیں:

فلم بننے کا مگر کوئی نہ امکاں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہاں پردہ تصویر سے مراد وہ پردہ سکرین ہو گیا ہے جس پر سینما میں فلم دکھائی جاتی ہے۔ اسی طرح تیسرے بند کے تیسرے اور چوتھے مصرعے کو دیکھیں:

گھیر رکھا ہے دسہرے نے دیوالی نے مجھے

کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

میں اصنام خیالی دراصل پردہ سکرین پر متحرک تصویروں کے معنی میں بدل گیا ہے۔

نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ فلم سازوں نے مرزا غالبؔ پر فلم سازی کر کے ان کی شاعری اور شخصیت کو مجروح کیا ہے۔ ایک دفعہ اتفاقاً مرزا غالبؔ ان فلم سازوں سے جا ملتے ہیں۔ غالبؔ جب میک اپ میں سجی لڑکی کو دیکھتے ہیں تو ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی ہے:

بولے یہ خواب میں کون آ آ کے ڈراتا ہے مجھے

سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

یہ لڑکی میک اپ میں جس طرح اپنے اصل حسن سے کوسوں دور تھی اور یہ طنز تو اس کی شکل وصورت پر تھا اسی طرح جب یہ لڑکی غالبؔ سے محوکلام ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان بھی معیار سے گری ہوئی ہے اور اس کا تلفظ انتہائی دیہاتی ہے۔

اس پہ بولی کہ گالب جی گجل گا کے سناؤ
تم تو سائر ہو جیادہ ہمیں نکھرا نہ دکھاؤ
لانگ شاٹ آیا ہے میں ناچوں گی تم ٹپہ لگاؤ
فارسی بول کے اردو میں تو ہلڑ نہ مچاؤ
مرزا بیدل کی لکھت پھارسی دانی مانگے
آپ کے ریختے کا کاٹا نہ پانی مانگے

اس صورت حال میں غالبؔ خود تو پکار اٹھتے ہیں:

فلم سازوں میں چلا آیا یہ تھا میرا گناہ
میرا ان ناچنے والوں سے نہیں ہو گا نباہ

لیکن دو چار گیت مزید سننے کے بعد غالبؔ فیصلہ کرتے ہیں:

شاعری قتل ہوئی ریکھتے کا خون بہا
جیتے جی ہم نے سنا ظلم ایسا نہ سہا

ہم سب جانتے ہیں کہ غالبؔ اپنے طرز بیان ہی پر ناز فرمایا کرتے تھے اور اپنے الفاظ کو گنجینہ معنی کا طلسم جانتے تھے۔ اس نظم میں سب سے زیادہ اور خطرناک حملہ ان کی زبان پر ہی کیا گیا ہے اور فلم ساز ان کی زبان کو بگاڑ بگاڑ کر بول رہے ہیں۔ قوال ان کی غزلوں کا خون کر رہے ہیں۔ ہیروئن غالبؔ کو عام فلمی شاعر سمجھے ہوئے ہے اور خوامخواہ ان سے بے تکلف ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم سازوں میں آ کر مرزا لاحول پڑھنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن نظم میں ایک باریک نکتہ ایسا بھی ہے جو سید محمد جعفری کی نظم کے پلاٹ کو کہانی کی طرح مربوط و مضبوط بھی بناتا ہے اور ان کی ذہانت و فطانت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ وہ باریک نکتہ یہ ہے کہ آخری بند میں غالبؔ خود ریختہ کو ریکھتہ کہتے نظر آتے ہیں۔ یعنی فلم سازوں نے ان کی شاعری اور شخصیت کو فلم میں مسخ کیا سو کیا لیکن خود مرزا غالبؔ بھی فلم سازوں میں آ رہیں تو ان کی زبان بھی خراب ہو جائے گی۔ یوں یہ نظم محض غالبؔ سے نکل کر تمام زبان اور اہل زبان کو انتباہ کرتی ہے کہ وہ فلم سازوں سے دور رہیں اور فلم سازوں کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ فلم سازی میں زبان کے معیار کا خیال رکھیں۔
موجودہ دور میں جب غالبؔ کو سمجھنے کے لیے ان پر بنے ہوئے ڈرامے اور فلمیں واحد کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے لگے ہیں سید محمد جعفری کی نظم مرزا غالبؔ کی درست تفہیم کے لیے معتبر ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیتی ہے۔

پیروڈی طنز و مزاح کا ایک کامیاب حربہ ہے۔ پیروڈی ہمیشہ مقبول و معروف اور زبان زدعوام وخواص کلام کی ہوتی ہے۔ جب تک قاری اصل کلام نظم ونثر سے آشنا نہیں ہوگا وہ پیروڈی سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ جب تک اصل کلام قاری کے ذہن میں موجود نہ ہو پیروڈی کا کمال اور لطف ظاہر نہیں ہوتا۔ غالب کی مقبولیت کے پیش نظر ان کی شاعری اور نثر کی بہت سی پیروڈیاں کی گئیں۔ شعر کی نسبت نثر پارے کی پیروڈی دشوار ہوتی ہے۔

غالب کی نثر کے منفرد اور نادر اسلوب نے اردو نثر کو بہت متاثر کیا۔ غالب کے اسلوب نے جدید اردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ غالب کی نثر کے منفرد اور مقبول اسلوب نے مزاح نگاروں کو اس نثر کے اسلوب کی تحریف پر بھی اکسایا۔ محمد خالد اختر نے میرزا اسد اللہ خاں غالب کی طرز خاص میں ۵۱ خطوط لکھے۔ ان خطوط کی اوّلین نمود ماہنامہ افکار کراچی میں ہوئی۔ بعد ازاں محمد خالد اختر نے عود پاک کے نام سے مجلّہ فنون میں بھی غالب کی طرز خاص میں کچھ خطوط لکھے۔ یاد رہے کہ غالب کے خطوط کے ایک مجموعے کا نام عود ہندی ہے اور عود پاک بذات خود ایک تحریف ہے۔ خطوط کی صورت میں طنز و مزاح کا یہ اچھوتا انداز اردو ادب کے قارئین کو بہت اچھا لگا۔ اور مکاتیب کا یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر محمد خالد اختر نے چند ایک مکاتیب اسی انداز کے ملک کے دوسرے ادبی رسالوں سویرا، پاکستانی ادب اور معاصر کے لیے بھی لکھے۔ یہ تمام خطوط کتابی صورت میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے مکاتیب خضر کے نام سے شائع کیے۔

محمد خالد اختر کے خطوط غالب کے خطوط کی تحریف نہیں بلکہ خود غالب کے اسلوب کی پیروی کی ایک کوشش ہے۔ ان خطوط میں مکتوب الیہان مختلف سیاسی و ادبی شخصیات ہیں اور خط نگار خود محمد خالد اختر۔ اور جہاں کہیں انہوں نے خضر کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد بھی خود خالد محمد اختر ہیں۔ محمد خالد اختر غالب کے اسلوب کی پیروی میں کس حد تک کامیاب ہوئے یہ ایک مختلف سوال ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ یہ خطوط ادبی دنیا میں مقبول ضرور ہوئے۔

غالب کی نثر کا مجموعی آہنگ ظریفانہ نہیں ہے۔ تاہم غالب کی ظرافت ان کے خطوط میں ایک نمایاں صفت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالب کی ظرافت میں شگفتگی و خوش طبعی ہے اور جہاں کہیں طنز و تعریض ہے وہاں اس کا شکار خود غالب ہیں۔ اگر قاطع برہان کے سلسلے میں لکھے گئے خطوط کو نظر انداز کر دیں تو غالب نے اپنے طنز کے نشتر بالعموم کسی دوسرے پر استعمال نہیں کیے۔ مگر محمد خالد اختر کے اسلوب میں شگفتگی سے زیادہ طنز موجود ہے اور ان کے طنز کے شدید وار سے کوئی محفوظ نظر نہیں آتا۔ رئیس امروہوی کے نام خط سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''قبلہ وکعبہ۔ جزائے خیر
ایک بات مسلم ہے امروہہ کی خاک سے جس کا خمیر اٹھا ولایت اس کو میراث میں ملی صاحب وجدان اور قطب ہونا اس کی خصلت قرار پایا۔ تسخیر جنات، ٹیلی پیتھی، ستارہ شناسی اور اس قماش کے منجملہ علوم اس کو قسام ازل سے پنگوڑے ہی میں ودیعت ہو گئے الغرض امروہے سے نکلا تو ایک لشکر جنات اور غولوں کے جلو میں چلا۔ صاحب امروہہ ولی خیز خطہ ہے اور دوسرے قصبوں کے اولیا جو تھوڑے بہت ہیں امروہہ والوں کے آگے دم نہیں مار سکتے۔''

مشفق خواجہ کی غالب سے دلچسپی اور غالب شناسی میں ان کے مرتبے کا اندازہ ان کی کتاب ''غالب اور صفیر بلگرامی'' سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ انہوں نے محمد خالد اختر کے خطوط پر تبصرہ کے لیے خط ہی کی ہیئت استعمال کی اور غالب ہی کا اسلوب۔ ان کے خیال میں محمد خالد اختر غالب کے اسلوب کی پیروی میں ناکام رہے۔ انہوں نے محمد خالد اختر کی زبان کی اغلاط کی نشاندہی کی۔ مشفق خواجہ کے خیال میں یہ خطوط غالب دوستی نہیں غالب دشمنی کی مثال ہیں اسی لیے انہوں نے محمد خالد اختر کو یگانہ چنگیزی کے بعد ایک اور غالب شکن قرار دیا۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع محمد خالد اختر کے خطوط نہیں بلکہ غالب کے خطوط کی پیروڈیاں ہیں۔ اور چونکہ مشفق خواجہ کا یہ خط بھی غالب کے اسلوب میں ہی لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ اور دیکھئے اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔

''سعادت و اقبال نشاں، اختر فلک معنی و بیان، محمد خالد المتخلص بہ اختر کو غالب خستہ کا سلام پہنچے۔ تمہاری کتاب بہ سبیل ڈاک آئی۔ تمہارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیونکر شایان لطف گردانا۔ یہاں بہت سوں سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو، ظرافت میں ید طولیٰ رکھتے ہو، یعنی عجیب وغریب ہو لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ تقریظ نویس مسمی محمد کاظم کون ذات شریف ہے۔ میرے زمانے میں چھاپے کی کتاب پر تقریظ وہ لکھتا تھا جو چار دانگ عالم میں نامور ہوتا تھا۔۔۔۔ تقریظ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ تم نے میرے انداز وروش میں نامہ نگاری کی کوشش کی ہے۔ اگر تقریظ میں باصراحت یہ امر ملحوظ نہ ہوتا تو میرے لیے یہ قیاس کرنا بعید از امکان تھا کہ تم میرے

مقلد ہو۔میں نے کتاب کی ورق گردانی کی'مومن وصہبائی کوبھی دکھائی'مفتی صدر
الدین آزردہ سے بھی مشورت کی لیکن یہ سب متفق اللسان ہوکر کہتے ہیں کہ تم نے جو
مشقت کھینچی ہے اور جس طرح جگرخون کیا ہے اس کا مجھ غریب کی نامہ نگاری سے کوئی
تعلق نہیں۔''

غالب کے اسلوب کی پیروی میں ایک خط مقصود حمیدی نے بھی لکھا جس کا ذکر انور سدید نے اپنی کتاب''غالب کے نئے خطوط''میں کیا ہے۔اس خط میں بھی محمد خالد اختر کواسلوب غالب کی پیروی میں ناکام بتایا گیا تھا۔یہ خط ماہنامہ تخلیق لاہور میں چھپا۔انور سدید کواس کے بعض مندرجات سے اتفاق نہ تھا اس لیے انہوں نے اسی انداز میں ایک خط مدیر تخلیق کولکھ مارا۔اس انداز واسلوب کو پسند کیا گیا اس لیے انور سدید نے ہر ماہ تخلیق کواسی طرح خط لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔یہ خطوط''غالب کے نئے خطوط'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔یہ خطوط غالب کی کامیاب پیروڈی اس لیے بھی نظر آتے ہیں کیونکہ ان میں جگہ جگہ غالب کی اصلی تحریر کے ٹکڑے جوڑے گئے ہیں۔انور سدید کے خط سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''برخوردار سعادت و اقبال نشان اظہر جاوید کو میری دعا پہنچے۔۔۔۔۔بھئی مجلّہ
''پاکستانی ادب''میں خضر کا خط رئیس سخن رئیس امروہوی ثم کراچوی کے نام میں نے پڑھا
تھا۔تمہیں معلوم ہو کہ فقیر خضر نے بیسویں صدی کے ربع سوم میں میرے طرز سخن کومکرر
جاری کیا۔اپنی باتوں کومیرے انداز میں بیان کیا۔سبحان اللہ رموز ادب میں اکثر اس کو
اپنا ہم طالع اور ہم خیال پایا۔میرا ہم قلم تو سراسر قلم رو ہندوستان و پاکستان میں نہیں مگر
ہاں اس نے ہنسی،مذاق،طنز،بذلہ،مزاح اور جگت کا اچھا معیار قائم کیا۔بات سے بات
نکالی اور خوب نکالی اگرچہ طول کلام کا شکار ہوا۔''

انور سدید کے خیال میں محمد خالد اختر نے اکثر وبیشتر غالب کے اسلوب کی کامیاب پیروڈی کی ہے۔اب تک''غالب کے خطوط'' کی جن پیروڈیوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ محمد خالد اختر کی''مکاتیب خضر'' کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ردعمل کے طور پر سامنے آئیں۔اس کے علاوہ دیگر مزاح نگاروں نے بھی غالب کی خطوط کی پیروڈی کی۔ابن انشا نے پیروڈی کی شکل میں چار خط لکھے۔جو ان کی کتاب خمار گندم میں شامل ہیں۔یہ خطوط اخبار خواتین کراچی میں شائع ہوئے تھے۔ان خطوط میں سے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''لومرزا تفتہ ایک بات لطیفے کی سنو۔کل ہرکارہ آیا تو تمہارے خط کے ساتھ ایک خط

کراچی بندر سے منشی فیض احمد فیض کا بھی لایا۔جس میں لکھا ہے کہ ہم تمہاری صد سالہ برسی مناتے ہیں۔جلسہ ہوگا جس میں تمہاری شاعری پر لوگ مضمون پڑھیں گے۔بحث کریں گے۔تمہاری زندگی پر کتابیں چھپیں گی۔ایک مشاعرہ بھی کرنے کا ارادہ ہے۔تم بھی آؤ اور خرچہ آمد و رفت کا پاؤ۔دن کی روٹی اور رات کی شراب بھی ملے گی۔بہت خیال دوڑایا سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔اگر شاعر ہیں تو کس کے شاگرد ہیں۔''

یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ غالب کی پیروڈیوں کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہی زمانے میں جاری رہا۔یہ زمانہ ان کے برسی کی صد سالہ تقریبات کے اردگرد کا زمانہ ہے۔یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ پھر مسلسل جاری رہا اور ابھی تک جاری ہے۔اس سلسلہ کی تازہ ترین کتاب ''غالب کا دسترخوان'' ہے جس کے مصنف انور احمد علوی ہیں۔انہوں نے کتاب کے عنوان کے ساتھ قوسین میں باقاعدہ پیروڈی بھی تحریر کیا ہے۔یہ کتاب اکادمی بازیافت نے پہلی مرتبہ ۲۰۰۷ میں چھاپی اور کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے یہ خطوط اخبار خواتین اور دوسرے رسالوں میں چھپتے رہے۔اس کتاب میں کچھ اور جدتوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔کتاب کا ابتدائیہ مریخ مکین اسد اللہ خان غالب نے لکھا ہے۔یعنی یہ بھی غالب کی پیروڈی ہے لیکن خط کی شکل میں نہیں۔خطوں پر عنوانات بھی دیے گئے ہیں۔جناب انور احمد علوی کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''اگلے ہفتے دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی تشریف لائے۔دراز قد، دبلے پتلے، بھولے بھالے، گورے نہ کالے۔ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ پکڑے ہوئے۔تمہارا خط دیا۔بندگی کہی اور بیٹھ رہے بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔فرمایا عزیز جبران۔قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا انصاری ہیں۔پیشہ پوچھا، پروفیسر نکلے۔یعنی پروفیسر عزیز جبران انصاری۔''

متذکرہ بالا مزاح نگاروں کے علاوہ بعض غیر معروف لوگوں نے بھی غالب کی پیروڈی یقیناً کی ہوگی۔مجھے یاد ہے طالب علمی کے زمانے میں ہمارے علمی و ادبی مجلّہ شاہین میں بھی کسی طالب علم نے اس قسم کے خطوط لکھے تھے۔ایک دفعہ کسی میڈیکل کالج کے ایک میگزین میں اسی قسم کی تحریر نظر سے گزری تھی۔یہ تمام تحریریں غالب کی بے پناہ مقبولیت اور ہردل عزیزی کا ثبوت ہیں کیونکہ پیروڈی کے لیے بنیادی شرط ہی یہی ہے کہ وہ کلام نظم و نثر مقبول و معروف ہو اور قارئین کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہو۔اس کثرت سے پیروڈی کے لیے غالب کا انتخاب ان کی ہردل عزیزی کی دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالبؔ کے اُردو قصائد میں تشبیب کا موضوعاتی تنوع

سکندر علی

غالب نے جن اصنافِ سخن میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا وہ غزل، قصیدہ اور مثنوی ہیں، لیکن اردو شاعری میں غالب کی شہرت کا حوالہ اُردو غزل ٹھہری۔ جہاں تک اُردو قصائد کی بات ہے غالب نے بہت کم قصیدے کہے۔ ان کے اُردو دیوان میں صرف چار قصیدے ہیں۔ دو قصیدے حضرت علی کی منقبت میں اور دو قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ ان میں تین قصائد انتہائی مختصر ہیں جب کہ سب سے بڑا قصیدہ جس کی تشبیب میں مہِ نو سے خطاب کیا گیا ہے اٹھاون اشعار پر مشتمل ہے

ان قصائد میں غالب نے قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی کو برتا ہے اور چاروں قصائد میں تشبیب، گریز، مدح اور دُعا کے حصے موجود ہیں۔ ہمارے ہاں قصیدہ عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں آیا۔ اسی لیے اُردو قصیدے کے اجزائے ترکیبی کی بنیاد بھی عربی و فارسی قصیدے پر رکھی گئی ہے۔ قصیدے کا ابتدائی حصہ تشبیب کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنے عہدِ شباب کا تذکرہ کرتا ہے لیکن اس کا موضوع صرف جوانی کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ تشبیب میں شاعر زندگی کے ہر موضوع کو بیان کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے قصائد کی تشبیب میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔

بقول جمیل جالبی وہ ''تشبیب'' سے سننے والے کو اپنی رنگینی گفتار سے متاثر کرتے ہیں۔ غالب موقع محل کے مطابق کبھی تصوف و حکمت اور فلسفہ و علم نجوم کے نکات پیش کرتے ہیں کبھی دلچسپ پیرائے میں موسم کا حال بیان کرتے ہیں، نمودِ صبح کی دلکش تصویر کشی کرتے ہیں، کبھی مکالماتی تکنیک کا استعمال کر کے قصیدے کو ڈرامائی شکل دے دیتے ہیں، کبھی ناقدری زمانہ کا ساز پر اثر انداز میں چھیڑتے ہیں۔

قصیدے کا سب سے اہم جز ''مدح'' ہوتا ہے۔ غالب کے قصیدوں میں مدح کے دو رنگ ملتے ہیں ایک وہ مدح جس میں عقیدت اور محبت کا عنصر غالب ہے جو حمد، نعت اور منقبت میں خاص طور پر نمایاں ہے اور ایک وہ مدح ہے جس میں دلی انسیت اور عقیدت کم ہے اور حالات کے تقاضوں کے باعث ضرورت، تکلف اور تصنع زیادہ پایا جاتا ہے۔ پہلا قصیدہ جو ''منقبتِ حیدری'' کے عنوان سے ہے۔ غالب کی مشکل پسندی کا رنگ لیے ہوئے ہے، اس میں فارسی لہجہ اور فارسیت غالب نظر آتی ہے۔ اس کی تشبیب بہاریہ ہے۔ مثلاً

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار	سایہ لالہ بے داغ سوایدئے بہار
مستی بادِ صبا سے ہے بہ عرضِ سبزہ	ریزہ شیشہ مَے جوہرِ تیغِ کہسار

اس قصیدے کی بہ نسبت منقبت کا دوسرا قصیدہ قدرے صاف اور قابلِ تفہیم ہے۔ غالب نے اپنے قصائد کی تشبیب میں بہت زور دکھایا ہے اس قصیدے کی تشبیب میں انہوں نے نظریہ وحدت الوجود بیان کرتے ہوئے کائنات کی نفی کی ہے اور اس کے متعلقات سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

دہر جُز جلوہ یکتائی معشوق نہیں	ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت	سخن، حق ہمہ پیانہ ذوقِ تحسیں

دیوانِ غالب میں بہادر شاہ ظفر کی مدح میں دو قصیدے ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ غالب نے اپنے ہم عصر یا پیش رووں کی طرح پر شکوہ، حد درجہ ثقیل اور دقیق الفاظ و تراکیب کا استعمال نہیں بلکہ ان قصیدوں میں غالب کے کچھ اشعار سہلِ ممتنع کا درجہ رکھتے ہیں۔ قصیدے کی تشبیب میں پہلے غالب نے اپنے اور ہلالِ عید کے درمیان بڑا دلچسپ مکالمہ تحریر کیا ہے پھر ہلالِ عید کو مخاطب کر کے مدح کا پہلو نکالا ہے اور دُعا پر خاتمہ کلام کیا ہے۔ یہ تشبیب ایک اچھوتا انداز لیے ہوئے ہے، اس میں دل کشی بھی ہے اور تاثیر بھی، شاعر اور ہلالِ عید کے درمیان مکالمہ ملاحظہ کیجئے۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام	جس کو تُو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسمان نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!	حبذا اے نشاطِ عامِ عوام!
عذر میں تین دن نہ آنے کے	لے کے آیا ہے عید کا پیغام؟

مکالماتی تکنیک نے قصیدے کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے اس میں مزید برجستگی اور بے تکلفی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے جب وہ کہتے ہیں۔

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام؟
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

سوال و جواب کے اس انداز نے قصیدے کو ڈرامائی تشکیل دے دی ہے جس میں فطری پن بھی ہے، اس کے ساتھ ساتھ زبان آسان وسادہ ہے اور لہجہ عام بول چال کا ہے۔ چوتھے قصیدے کی تشبیب بھی بڑی پُر کشش ہے اس میں خوب صورت الفاظ اور عمدہ تشبیہات کے ساتھ دلکش فضا باندھی گئی ہے۔ روانی، سلاست اور تسلسل کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

صبح دم دروازہ خاور کُھلا مہرِ عالم تاب کا منظر کُھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینہ گوہر کُھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کُھلا

غالب کی قصیدہ گوئی کی جو خصوصیات ہیں ان میں جدت پسندی، نکتہ آفرینی، مبالغہ آرائی، الفاظ کی بندش، صنائع و بدائع کا فطری و غیر ارادی استعمال خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہے۔ غالب کی کمزوری یہ رہی کہ انہوں نے اُردو قصیدہ گوئی پر خاص توجہ نہیں دی۔ اگر وہ اس جانب متوجہ ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ قصیدے کے بہت بڑے شاعر ہوتے اور قصیدہ نگاری کے حوالے سے سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا نام ضرور لیا جاتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''غالبؔ کی شاعری اپنے سارے غم واندوہ کے باوجود ہمارا قیمتی تہذیبی سرمایہ ہے جس میں ان کی شخصیت کی رعنائی نے زندگی سے رس نچوڑے ہیں اور آلام روزگار سے ٹکر لینے کی کوشش نے توانائی پیدا کردی ہے۔

(ڈاکٹر سید احتشام حسین)

عہدِ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ کے تناظر میں

نصر اقبال (پی ایچ ڈی اسکالر)

مرزا اسداللہ خان غالب بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی غالب نے آفاقی شہرت حاصل کی۔ اردو ادب میں دیکھا جائے تو ان کی نثر نگاری میں وجہِ شہرت ان کے خطوط ٹھہری۔ ان کی پیدائش سے لے کر آخری ایام زیست تک سوانح پر نگاہ ڈالی جائے تو جہاں ان کے مداحوں نے محبتِ غالب میں سرشار ہو کر قلم اٹھایا وہاں ذاتی زندگی پر مشتمل واقعات کا اظہار غالب نے خود اپنے خطوط سے بھی کیا۔ ادبی اصطلاح میں دیکھا جائے تو بظاہر خطوط نویسی ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت کا تحریری ذریعہ رہی ہے خطوط نویسی کو اس لحاظ سے خاص مقام حاصل رہا ہے۔ یہاں تک کہ خطوط نویسی صنفِ ادب کی حیثیت حاصل کر چکی ہے اس کی سب سے بڑی مثال نامور ادباء کے خطوط مجموعے کی صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کا مجموعہ "غبار خاطر" اور غالب کے خطوط کا مجموعہ موجود ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خطوط کے ذریعے انسان کی ذاتی شخصیت کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ذریعہ ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنے جذبات کا اظہار بآسانی کر سکتا ہے۔

مرزا غالب نے جدید اردو نثر کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا اور نثر نگاری کے حوالے سے انہوں نے 1818ء کے لگ بھگ دوست احباب کو خطوط لکھنا شروع کیے۔ اپنے خطوط کے ذریعے انہوں نے اس قدر دلچسپ اظہار بیان اختیار کیا کہ ہر طرف ان کے اندازِ تحریر کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس حوصلہ افزا تاثر نے غالب کی خطوط نویسی کو وسعت بخشی اور انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے خطوط کے دو مجموعے شائع کروا دیے۔ غالب کے خطوط کے ذریعے ان کا انداز گفتگو سامنے آتا ہے۔ جس زبان کا استعمال کرتے، وہ حقیقتاً سادہ نہ تھی۔ وہ اپنی تحریروں پر اس قدر گرفت رکھتے تھے کہ ہنسی مذاق میں بھی طنز اور غصے کی بھرمار کر جاتے۔ غالب کے عہد کو ان کے خطوط کے حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی زندگی کے معاملات کو مکتوب نگاری کے ذریعے اپنے احباب کے ساتھ بیان کر کے تاریخ رقم کر دی۔

خطوط نویسی قدیم اردو ادب کی اہم قسم ہے۔ بظاہر کسی ایسے شخص سے دل کی روداد بیان کرنے کے لیے اس شخصیت کا

موجود ہونا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔لیکن کسی بھی مجبوری کی صورت میں اپنے عزیز و اقارب یا دل کے قریب لوگوں سے خطوط نویسی کے ذریعے اپنے دکھ درد بانٹ لینا بھی معقول ذریعہ ہے۔عربی زبان میں لفظ خط کے معنی سطر یا لکیر کے ہیں۔لیکن عربی میں ہی یہ لفظ اصطلاحی طور پر تحریر کے معنوں میں مستعمل ہے۔اس ضمن میں دیکھا جائے تو غالب کے خطوط ان کے نثری ادبِ صنف میں اہم ترین اضافہ ہیں۔خطوط کے ذریعے کوئی بھی شخص بہتر از ملاقات اپنے دل کی باتیں بیان کر سکتا ہے کیونکہ آمنے سامنے ملاقات کی صورت میں بہت سی غلط فہمیاں اور تلخ حقائق سامنے آنے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔اس کے برعکس خطوط کے ذریعے کسی بھی قسم کی غلط فہمی کا ازالہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔اردو ادب میں خطوط نویسی یا مکتوب نگاری کی روایت بہت مستحکم صورت اختیار کر چکی ہے جس کی واضح دلیل قدیم مشاہیر کے خطوط کے مرتبہ مجموعے کی شکل میں موجود ہے۔

غالب کے خطوط فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔غالب کی زندگی میں ہی ان کا مجموعہءِ خطوط "عود ہندی" کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔جبکہ اس کے فوراً بعد ان کا دوسرا مجموعہ بھی منظر عام پر آ گیا۔عہد غالب ان کی خطوط نویسی کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے اپنے خطوط کے ذریعے اپنی تاریخ پیدائش اور نام و نسب کے حوالے سے واضح کر دیا تھا جس کے مطابق وہ 8 رجب 1212 ہجری میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔اس حوالے سے انہوں نے اپنے خط بنام نواب علاؤالدین احمد خان میں ذکر کیا۔اسی طرح انہوں نے منشی حبیب اللہ خان حیدر آبادی کے نام بھی ایک خط میں 8 رجب کا ہی ذکر کیا ہے۔لہٰذا غالب کے خطوط کے تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا سن پیدائش 27 دسمبر 1897ء ہے۔غالب نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا کہ نواب الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم سے ان کی شادی 13 برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔اور وہ آخر عمر تک امراؤ بیگم کے ساتھ رہے۔ازدواجی زندگی کے حوالے سے بھی غالب نے اظہار کیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے حالانکہ دونوں کی طبیعت میں واضح فرق تھا۔غالب فطرتاً رند تھے جبکہ ان کی بیوی نیک و پرہیزگار خاتون تھی۔

اپنے آباؤاجداد کے حوالے سے غالب نے یہ اشارہ دیا کہ ان کا پیشہ سپہ گری ہونے کے باوجود غالب کے حصے میں وجہِ شہرت شاعری ہی ٹھہری۔اسی طرح اپنے خاندان کے بارے میں ایک خط کے ذریعے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے حقیقی چچا نصر اللہ خان مرہٹوں کی فوج میں صوبیدار کے عہدے پر فائض رہے۔پھر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہاں ہی گزار دیا۔غالب نے اپنے عہد کے حوالے سے خطوط کے ذریعے آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا بچپن عیاشیوں اور رنگینیوں میں گزرا۔غالب کے خطوط سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہاں کی تہذیب اور رسم و رواج میں عیش و عشرت اور فسق و فجور کی فضا موجود تھی۔لہٰذا غالب کا ان خرافات میں مشغول رہنا کوئی اچنبے کی بات نہ تھی۔

اردو خطوط نویسی میں مرزا غالب کا انداز بے تکلف اور بے ساختگی پر مبنی رہا۔ علاقائی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے ہوئے ہر خط میں مکتوب الیہ کو انوکھے انداز میں مخاطب کرتے دکھائی دیتے۔ وہ اپنے خطوط میں اس قدر روانی اور سلاست برتتے کہ ان کے خطوط حقیقت میں ان کی باتیں معلوم ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ خطوط کے اندر ہی مکالمہ نگاری پر آ جاتے۔ وہاں ان کے مکالمے ڈراما یا ناول کا لطف دیتے ہیں۔ ان کے فن کی عکاسی مکتوبات سے عیاں ہوتی ہے۔ فنی محاسن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے خطوط میں شوخی و ظرافت اور بعض اوقات سادگی ملتی ہے جو کہ غالب کو دیگر مکتوب نگاروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ اردو ادب میں غالب نے اپنے عہد میں خطوط نویسی کو جدت بخشی۔ حتٰی کہ جدید افسانوی ادب اور ڈراما میں جو مکالمے لکھے جاتے رہے ان کی چاشنی خطوط غالب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اپنے دل کی بات انتہائی پر تکلف انداز میں کہہ جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے خطوط میں آورد کی بجائے آمد کی سی فضا قائم ہو جاتی تھی۔

نثر نگاری کے حوالے سے غالب کی پہلی نثری تصنیف "پنج آہنگ" ہے جس کے پہلے باب میں مرزا نے خط لکھنے کے آداب اور طریقہ کار سے آگاہی دی۔ جبکہ آخری باب میں چند خطوط کو شامل کر دیا گیا۔ ان کے نثری سرمایہ میں منشی شیو نرائن اور ہر گوپال تفتہ کا خصوصی عمل دخل رہا جنھوں نے خطوطِ غالب کا مجموعہ چھاپنے کی خواہش میں مرزا سے رائے چاہی تو مرزا نے 20 نومبر 1858ء کے ایک خط میں ان کو لکھا کہ رقعات چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے مت پوچھو۔ غالب کے خطوط سے عہد غالب میں بولی جانے والی زبان اور لب و لہجہ کا اظہار بھی ملتا ہے۔ غالب کے دور میں مشکل سے مشکل موضوعات بھی سامنے آتے رہے لیکن وہ اس قدر آسان اور شگفتگی سے ان موضوعات کو پیش کرتے کہ اردو نثر کو دلکش بنا دیتے۔

عہد غالب کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی معاملات کے بہت سے علوم کے بارے میں خطوط غالب کے ذریعے معلومات ملتی ہیں۔ دلی کے رہنے والے لوگوں کی طرزِ بود و باش، پریشانیاں اور الجھنیں وغیرہ کے بارے میں غالب نے برملا اظہار کیا۔ لوگوں کا رسم و رواج اور طرزِ معاشرت آپس میں کیسا تھا، خطوط غالب کے ذریعے واضح ہو جاتا ہے۔ ان کے ذریعے شرفاء اور امراء کی زندگیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ بالخصوص مغل حکمرانوں کی نااہلی کے سبب انگریزوں کا برصغیر پر قبضہ کرنا اور سیاسی صورتحال کا یکسر تبدیل ہونا بھی خطوط غالب کے ذریعے ہی سامنے لایا گیا ہے۔

سیاسی، سماجی، ادبی اور علمی تحریکوں کے انسانی زندگی پر اثرات کے بارے میں غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے جا بجا تحریر کیا۔ ان کے شاگردوں اور دوست احباب کی طویل فہرست موجود ہے جنہیں وہ اکثر خطوط ارسال کرتے رہتے اور مذہب اور

تہذیب وتمدن سے بالاتر ہوکر حالات سے آگاہ کرتے رہتے ۔ان کے شاگردوں میں ہندواور مسلمان دونوں مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ وہ اپنے تعلقات میں مذہب کو کبھی آڑے نہیں آنے دیتے تھے۔ پھر دوستوں کو خطوط لکھتے اوران کے کلام کی خطوط کے ذریعے اصلاح بھی کرتے رہتے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مغل بادشاہ اورنگزیب کی وفات کے بعد پوری سلطنت ہنگاموں کا شکار ہوگئی۔انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جب مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت آخری سانس لے رہی تھی تو غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے ان تمام سیاسی حالات کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی۔ بالخصوص 1857ء کی جنگ آزادی سے نہ صرف غالب بلکہ بہت سے عام لوگ بھی بے حد متاثر ہوئے۔ غالب نے ان کٹھن حالات کا ذکر کرتے ہوئے ہر گوپال تفتہ کو خط لکھا۔ غالب کے خطوط میں محض ان کی ذاتی زندگی اور حالات وواقعات کا ہی ذکر نہیں بلکہ مجموعی طور پر ماحول اور معاشرتی حالات اور غدر جیسے حالات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے دوران کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا محفوظ نہ رہا۔ ادیب اور حساس طبیعت کے لوگ ان حالات سے سخت متاثر ہوئے۔ غدر کے حوالے سے غالب نے اپنے جذبات اور احساس محرومی کا خطوط کے ذریعے بارہا ذکر کیا۔ جنگ آزادی کے حوالے سے غالب کے جذبات اور مشاہدات کا اظہار خطوط غالب کے ذریعے سامنے آتا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غالب اس دور میں بغاوت سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال کے چشم دید گواہ تھے۔انہوں نے برصغیر کے حالات کو اپنے خطوط کے ذریعے قلم بند کیا جس کی بنا پر خطوط غالب کو تاریخی دستاویز کا مقام دیا جاسکتا ہے۔

غالب کا دور تاریخی اعتبار سے انتہائی پرآشوب دور رہا۔ مزید براں یہ کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر غالب کے شاگرد تھے اوران کے بہت قدردان بھی رہے۔ غالب پر غموں کے پہاڑ بھی ٹوٹے تو انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور وہ سب کچھ خطوط کے ذریعے لکھ دیا جوان کے عہد میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات پیش آئے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے عہد میں 1857ء کے دوران پیدا ہونے والے حالات وواقعات سب سے زیادہ دردناک تھے لیکن انہوں نے خطوط کے ذریعے اپنے عہد کی درست سمت میں عکاسی کی۔ان کے خطوط محض کسی انسان کو متاثر کرنے کے لیے نہیں تھے بلکہ ان میں عہد غالب کے کرب و اَلم کی طویل داستان موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالبؔ کی تصانیف کا تعارف

مرزا غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادب تخلیق کیا۔ غالب کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

فارسی تصانیف:

کلیات غالب:

غالب کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن (۱۸۴۵ء) میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپا تھا۔اس کے بعد کلیات مکمل صورت میں مطبع نول کشور سے (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا۔

ابر گہر بار:

غالب کی یہ مثنوی کلیات فارسی میں شامل تھی۔اس مثنوی کا ایک الگ نسخہ بھی کلیات کی اشاعت کے بعد (۱۲۸۰ھ) میں چھپا تھا۔اس نسخے میں غالب کے چند فارسی قصیدے،قطعات،اور رباعیات بھی شامل تھیں۔بعد میں ان کو "سبد چین" میں شامل کر دیا گیا۔

دستنبو:

یہ کتاب غالب نے فارسی میں تحریر کی ہے۔پہلی بار (۱۸۵۸ء) میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں (۱۸۵۰ء) سے لے کر (۱۸۵۷ء) کے حالات و واقعات درج کیے گئے ہیں۔اس کتاب کا اردو ترجمہ بعد میں خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔اس ترجمے کو ترقی اردو بیورو نے (۱۹۹۴ء) میں شائع کیا۔

مہر نیم روز:

یہ کتاب بھی غالب نے فارسی میں تحریر کی ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے کا نام ''مہر نیم روز'' ہے۔مہر نیم روز میں غالب نے عہد تیمور سے ہمایوں تک کے تاریخی حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔دوسرے حصے کا نام ''ماہ نیم ماہ'' ہے۔اس حصے میں جلال الدین محمد اکبر سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک کے تمام واقعات کو درج کیا گیا ہے۔

قاطع برہان:

محمد حسین تبریزی کی فارسی لغت "برہان قاطع" کے نام سے لکھی۔ اس لغت میں غلطیاں موجود تھیں۔ غالب نے اس میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشان دہی کی اور اس کی اصلاح کے بعد غالب نے اس کا نام ''قاطع برہان'' رکھا۔ یہ کتاب (۱۲۷۶ھ) میں چھپی۔

سبد چین:

سبد چین کے نام سے فارسی کلام (۱۸۶۷ء) میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں وہ کلام ہے جو کلیات فارسی میں شامل نہ ہو سکا یا اس کے بعد لکھا گیا تھا۔ غالب کی وفات کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن نہ نکل سکا اور کتاب بالکل کمیاب ہوگئی تھی۔ حال ہی میں مالک رام نے اس کا نیا ایڈیشن تیار کیا جو جید برقی پریس دہلی میں چھپا اور مکتبہ جامع دہلی کی طرف سے شائع کیا گیا۔

پنج آہنگ:

پنج آہنگ غالب کی فارسی نثر کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطانی دہلی میں (۱۸۴۹ء) حکیم غلام نجف خاں کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن (۴۹۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اپریل (۱۸۵۳ء) میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ یہ تصانیف پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انشا پردازی کے نمونے ملتے ہیں۔

کلیات نثر غالبؔ:

''پنج آہنگ'' کا دوسرا ایڈیشن (۱۸۵۳ء) میں شائع ہوا۔ ''مہر نیم روز'' (۱۸۵۴ء) میں چھپی تھی۔ ''دستنبو'' کا دوسرا ایڈیشن (۱۸۶۵ء) میں نکلا تھا۔ یہ کتابیں جلد ہی نایاب ہوگئیں۔ اس لیے منشی لال کشور نے جنوری (۱۸۶۸ء) میں ان تینوں کو ''کلیات نثر غالب'' کے نام سے شائع کر دیا۔

درفش کاویانی:

درفش کاویانی دراصل ''قاطع برہان'' کا دوسرا حصہ ہے۔ جس کو غالب نے کچھ ترمیم اور اضافے کے ساتھ (۱۸۶۵ء) میں اکمل المطابع دہلی میں چھپوا کر خود شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں کل (۱۵۶) صفحات تھے۔

گل رعنا:

گل رعنا غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب غالب نے کلکتہ کے دوران قیام میں اپنے دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔ غالب کی یہ کتاب ناپید ہوگئی تھی۔ مالک رام نے اسے دلی سے شائع کرایا۔

باغ دو در:

باغ دودر غالب کے فارسی نظم ونثر کا مجموعہ ہے۔اس کا واحد قلمی نسخہ سید وزیرالحسن عابدی کے پاس محفوظ ہے۔اس مجموعے کو وزیرالحسن نے پہلے اورینٹل کالج میگزین میں چھاپا اور اب اس کو کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے۔ باغ دودر موجودہ صورت میں ۱۹۸صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو تصانیف:

دیوان غالبؔ:

اس میں مرزا غالب کا اردو کلام ہے۔ غالب کی زندگی میں ہی دیوانِ غالب (اردو) کے پانچ ایڈیشن چھپے۔اس دیوان کا پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں شائع ہوا۔ یہ نسخہ ۱۰۸صفحات پر مشتمل ہے اوراس میں ۱۰۹۵اشعار شامل ہیں۔ یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر کی طرف پہلا قدم تھا۔اس دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد،قطعات اور رباعیات ہیں۔

عود ہندی:

عود ہندی غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ہے۔جس میں (۱۶۲) خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ غالب کے انتقال سے چار مہینے پہلے ۱۷اکتوبر ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔

اردوئے معلیٰ:

اردوئے معلیٰ غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس میں (۴۷۲) خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ غالب کے انتقال کے (۱۹) دن بعد مارچ (۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا۔

مکاتیب غالبؔ:

اس میں مرزا غالب کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں مرحوم اور نواب کلب علی خاں مرحوم دربار رام پور کے نام لکھے تھے۔خطوط کے اس مجموعے کو مولانا امتیاز علی عرشی نے مرتب کر کے پہلی مرتبہ (۱۹۳۷ء) میں شائع کیا۔اس مجموعے کے لیے فاضل مرتب نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا اور تمام مکاتیب پر نہایت عمدہ حواشی تحریر فرما دیے۔

نکات در رقعاتِ غالب:

اس میں فارسی زبان کے چند اصولی قواعد سہل اردو زبان میں بیان کیے گئے تھے۔آخر میں ''پنج آہنگ'' سے پندرا فارسی مکاتیب شامل کر دیے گئے تھے۔

قادر نامہ:

اس مختصر سی کتاب کو غالب نے عارف کے بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ "آمدنامہ" اور "خالق باری" کی طرز پر لکھا گیا ہے۔''قادر نامہ'' کا پہلا ایڈیشن دہلی سے (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

انتخاب: عماد احسان (سال چہارم)

شیطان کا قید خانہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھے اُٹھتے تھے وہ مکان دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا صدرالدین خاں آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آے اس وقت مرزا صاحب اسی نوعمری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ:

''ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔''

مرزا نے کہا ''قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔''

شرح غالبؔ

از: مولانا غلام رسول مہرؔ

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حُسن تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بد خواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علَم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستانہ پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گُستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سَوا ہوتا ہے

۱۔شرح: میرا بے مہر محبوب شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے۔وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ظلم و جور، بے التفاتی اور تغافل کے بارے میں کچھ زبان پر لایا جائے۔اتنی بات بھی مجھے زبان پر نہ لانی چاہیے، کیونکہ یہ بھی گلے ہی کی ایک صورت ہے۔

۲۔ میں گلے شکوے سے اس طرح بھرا ہوا ہوں جیسے باجا راگ سے بھرا ہوتا ہے۔اُسے چھیڑتے ہی نغمے نکلنے لگتے ہیں۔مجھے بھی ذرا چھیڑ کر تماشا دیکھیے، گلے شکوے کیونکر شروع ہوجاتے ہیں اور شروع ہوجائیں گے تو اُن کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔

یہ مضمون مرزا نے ایک اور شعر میں بھی باندھا ہے:

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۳۔لغات: حُسنِ تلافی: عمدہ طریق پر بدلا دینا۔کسی کام کے سرانجام میں کوئی کمی یا خامی رہ جائے تو اُسے بہتر طریق پر پورا کرینا۔

شرح: اگرچہ میرا محبوب کمسنی یا سادگی کے باعث میرے شکووں اور گلوں کا مقصد نہیں سمجھتا، لیکن حُسنِ تلافی ملاحظہ کیجئے کہ میں جب کبھی اس کے ظلم وستم کی شکایت کرتا ہوں تو وہ پہلے سے زیادہ ظلم وستم شروع کردیتا ہے۔

حُسنِ تلافی سے ظاہر ہے کہ عاشق کا مدّعا مزید ظلم و جور کے سوا کچھ نہیں۔محبوب اس حقیقت کو نہیں سمجھتا، تاہم جب کبھی شکایتیں سنتا ہے تو مدّعا سمجھے بغیر مزید جور شروع کردیتا ہے۔

یہ مضمون بھی مرزا غالبؔ نے ایک اور جگہ باندھا ہے:

نالہ جُز حسنِ طلب اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

۴۔لغات: مکوکب: تاروں بھرا۔

شرح: عشق کے راستے میں ستاروں بھرے آسمان کی چال ایسی ہے، جیسے وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہے، جس کے پاؤں چھالوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

آسمان کو تاروں بھرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تارے آبلوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ گویا آسمان کے تارے بھی دراصل تارے نہیں، بلکہ اس کے پاؤں کے چھالے ہیں۔

۵۔لغات: ہدف: نشانہ

ناوک: تیر

شرح: ہم ظلم کے تیر کا نشانہ کیوں نہ بنیں؟ اگر کوئی تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا اور خطا ہو جاتا ہے تو ہم خود اسے اُٹھا لاتے ہیں اور ناوک انداز کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یوں وہ سمجھ جاتا ہے کہ ہمیں اس کا نشانہ بننے کی انتہائی آرزو ہے۔

۶۔شرح: ہماری قسمت کے ستارے کی نحوست کا یہ حال ہے کہ ہم بھلا کرنے کے خواہاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں، لیکن نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ گویا ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کیا اچھا ہوتا کہ ہم شروع ہی سے اپنے بدخواہ بن جاتے۔ چونکہ ہر چیز ہماری خواہش کے خلاف ہوتی ہے، اس بنا پر اپنی بدخواہی یقیناً بھلائی کا سبب بن جاتی۔

۷۔شرح: پہلے میری فریاد وفغاں میں اتنا زور تھا کہ وہ عرش سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کسی فریاد میں زیادہ سے زیادہ رسائی کی قوت ہو تو وہ لب تک آتی ہے، ورنہ اکثر آہیں سینے ہی میں رہ جاتی ہیں۔

۸۔لغات: باربد: خسرو پرویز شہنشاہ ایران کا مشہور درباری گویّا، جو شیراز کی سمت کا رہنے والا تھا۔

شرح: میرے قلم کو شعر کی محفل میں خسرو پرویز کے مغنی کی حیثیت حاصل ہے، جس کا نام باربد تھا۔ اب میرا قلم غزل کو چھوڑ کر بادشاہ کی مدح میں یوں نغمہ زن ہوتا ہے۔

۹۔ کواکب سپہ: جس کی فوج ستارے ہوں یا شمار میں ستاروں کے برابر فوج والا۔

مہرِ عَلَم: سورج کے جھنڈے والا یا وہ جس کا جھنڈا یا پرچم سورج جیسا ہو۔

اِکرام: عزت، توقیر، بخشش، عطا۔

شرح: اے شہنشاہ! جس کی فوج ستارے اور جس کا عَلَم سورج ہے یا جس کی فوج ستاروں کے برابر اور جھنڈا سورج جیسا ہے، تو نے جس جس کو عزت و توقیر بخشی اس کا حق کون ادا کرسکتا ہے؟

۱۰۔ نعل بہا: فارسی محاورے میں وہ رقم جو کسی حملہ آور کو ملک سے واپس کرنے کے لیے ادا کی جائے۔ اسے بدیں وجہ نعل بہا کہتے ہیں کہ وہ حملہ آور کے گھوڑوں کے نعلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ نعل بندی کی رقم کو بھی کہہ سکتے ہیں۔

شرح: اگر سات ولایتوں یعنی پوری دنیا کی آمدنی اکٹھی کر لی جائے تو وہ رقم تیرے لشکر کے گھوڑوں کی نعل بندی کی اُجرت ہوگی

۱۱۔ ناصیہ سیا: پیشانی، گھسنے والا۔

شرح: ہر مہینے پورا چاند ہلال بنتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تیری دہلیز پر پیشانی گِھستا رہتا ہے یعنی پیشانی گھستے گھستے چاند کی گولائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کی وہ صرف ہلال رہ جاتا ہے۔

۱۲۔ میں نے غزل کہتے کہتے مدح شروع کر دی، گویا غزل کے دستور کی پابندی نہ کرتے ہوئے گستاخی سرزد ہوئی۔ یہ بھی تیرے ہی لطف و کرم کا کرشمہ ہے، جو مجھ میں مدح کا ذوق حد درجہ بڑھتا رہتا ہے۔

۱۳۔ لغات۔ تلخ نوائی۔ وہ باتیں کہنا، جو تلخ ہوں۔ درد بھرے نغمے الاپنا۔

شرح: اے غالبؔ! وہ درد بھرے نغمے الاپ رہا ہوں۔ لیکن معافی کا خواستگار ہوں۔ انہیں سن کر بے مزہ نہ ہونا کیونکہ مجبور ہوں۔ آج میرا دل بہت دُکھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میرے شوق دانہیں اعتبار تینوں، آجا ویکھ میرا انتظار آجا

منظوم ترجمہ از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

شعر غالبؔ

زمن گرَت نہ بُوَد باور انتظار بیا
بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

ترجمہ

میرے شوق دا نئیں اعتبار تینوں، آجا ویکھ میرا انتظار آجا
اینویں لڑن بہانڑے لبھنا ایں، کیہ توں سوچنا ایں ستمگار آجا

بھانویں ہجر تے بھانویں وصال ہووے، وکھو وکھ دوہاں دیاں لذتاں نیں
میرے سوہنیا جاہزار واری، آجا پیاریا تے لکھ وار آجا

ایہہ رواج اے مسجد اں مندراں دا، اوتھے ہستیاں تے خود پرستیاں نیں
میخانے وِچ مستیاں ای مستیاں نیں، ہوش کر، بن کے ہُشیار آجا

تُوں سادہ تے تیرا دل سادہ، تینوں اینویں رقیب گُراہ پایا
جے تُوں میرے جنازے تے نہیں آیا، راہ تکدا تری مزار، آجا

سکھیں وسنا جے تُوں چاہونا ایں میرے غالبا ایس جہان اندر
آجارنداں دی بزم وِچ آ بہہ جا، ایتھے بیٹھ دے نیں خاکسار آجا

کلامِ غالبؔ

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مِرے کاشانے کی
درد دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مِرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُودپشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پنجابی ترجمہ: اسیرؔ عابد

اُوکھی گل اے کم کوئی آسان ہووے

ایہوی سَوکھا نئیں، بندہ انسان ہووے

ہنجواں دی واچھڑ گھر نُوں ڈھاہ لائی اے

کندھاں بُوہے رڑ کن، رڑا مدان ہووے

اَشکے جھل پریتاں دے، پَل پَل اودھر

آپے بندہ جائے، آپ حیران ہووے

رُوپ وکھالی دی اَکھ رکھی نظراں تے

چلکاں، بن بن پلکاں، شیشے جان ہووے

مقتل وِچ کیہہ عاشق عِیداں کر دے نیں

چن چڑھے جے برچھی باہر میان ہووے

مٹی بیٹھ اسی لَے گئے سَدّھراں، پچھے

تُوں تے تیری پُھلّاں رَنگی جان ہووے

دِل نُوں مَو جاں چکھے جے پھٹ سَدِّھراں دا

چیر کلیجے لُون، سوَاواں مان ہووے

اِک میرا سرکپ کے تائب ہو بیٹھا

ربّا! ایہہ پچھتان کوئی پچھتان ہووے

غالبؔ پیڑ اے دو، گُٹھ تھگڑے دی جھیڑا

تقدیروں عاشق دا گلماں آن ہووے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
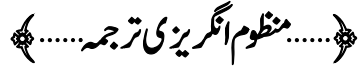
MIRZA GHALIB IN ENGLISH VERSE

Transled By:
Ralph Russell & Khurshid-ul-Islam

(i)

Ah me, my friend! The mentionof Calcutta's name
Has loosed a shaft that pierces to my very soul.
Its greenery and verdure take away your breath;
Its women's charms are such that none escapes them whole.
Their glances pierce the armour of the stoutest breast;
What heart withstands the blandishments of forms so fair?
All freshness and all sweetness are its luscious fruits;
Its mellow wines are pleasing beyond all compare.

(ii)

For centuries my ancestors were soldiers
My standing does not rest on poetry.

Broad-minded, I would live at peace with all men
Friendly with all, with none at enmity.

That I am Zafar's slave is ample honour....
Thought without wealth or rank or dignity,

Could I presume to cross the royal tutor?
I could not think of such temerity!

The King's all-seeing eye knows truth from falsehood:
I need no oath to pledge my honesty.

I make no claims to be an Urdu poet:
My object was to please Your Majesty.

I wrote the poem at the royal order.....
To tell the truth, out of necessity.

Nothing that I expressed in the last couplet
Intended any breach of amity.

I taunted none--or let my face be blackened!
I am not prone to such insanity!

My fortunes may be ill: not so my nature;
Thank God, I pass my days contentedly

God is my witness, Ghalib is no liar;
I set great store by my integrity.

Transled By:
Frances W.Pritchett & Owen T.A. Cornwall

(i)

Although it's hard enough for every task to be easy,
Not even humans can manage to be humane.
Weeping wants the ruin of my house,
Desertness drips from the doors and walls.
Cheers for the madness of ardor--at every moment
I have to go that way, and i alone have to be surprised.
Glory makes such a clain on vision--
Even the polish lines on the mirror want to be eyelashes.
The festiveness at the slaughter ground of the passionate--don't ask.
The Eid among sights is the sword be coming naked.
I took down into the dust the wound of the longing for joy.
Yo remain--and I will be a hundred-colored garden.
The morests of the heart relish the slash of longing,
The wounded liver plunges into the salt dish.
After my murder, she swore off cruelty--
Alas--the repentance of that quick repenter!
Alas for the cutting out of that bit of cloth, Ghalib,
In whose fate it is to be a lover's collar.

Transled By:
Anwar Hussain Syed

(i)

The beloved listens about me
But never reacts
So that there should be no room
For me to lodge a protest.

(ii)

Ghalib! I will relate to her
The story of your poor plight.
I can't take it upon me
That hearing it she calls you straight.

(iii)

O Love! what was in my house
To be devastated by your love's strife?
The long time desire to build it
Still survives.

(i)

I have not held my beloved in arms
For such a very, very long time now
For all those frenzied rounds of wine
All moments lit up by her company sublime

(ii)

Assembling all those broken pieces
Of my shattered liver and heart
I have now dared to invite
An assault of her eye lashes again

(iii)

I have been careful all along
Choking my breath in the bargain
For a number of years by now
Into rags my frock has not been torn

(iv)

By the warmth of my heart's all woes
I am now spitting sparks from my mouth
It has now been a very long time
That I have not visited the garden of lights.

(v)

Concerned about my hear'ts wounds
The love goes to seek to enquire about
With a thousand sprayers of salt in hand
To sprinkle that salt all over them.

(vi)

To dip the lashes of my eyes
In the blood ink of my heart
To do the art of some gardening there
To paint my garments all over red.

(vii)

My heart and my sight by now
Each others' villain they have now become
They both now claim the glimpse of her
And each of them wants her full concern.

(viii)

Into the love lane of disgrace
My heart is again obliged to brace
Leaving the house of pride behind
For it to vend for its own sake

(ix)

There is again a strong urge within
To look for customer of love again
What I shall have to part in bargain
My brain and heart and life's claim.

(x)

All my thoughts do wander about
After every beauty of this world
How I wish I enjoy the glee
Of a hundred gardens of roses and tulips.

(xi)

Again I wish that I could open
Her love letters that she had written
With my whole life pledged to her
But all her coquetry addressed thereon.

(xii)

My lust has once again now craved
That on the balcony we meet again
With her dark black tresses spread
All over her cheeks and her breasts.

(xiii)

How I wish again to have
That she be sitting just opposite to me
Alluring me with her antimony
Like the daggers fixed for the glean.

(xiv)

With the red glow of red wine
All her flushed face so flowered fine
I am indeed looking for such a one
That she should visit my harem just once.

(xv)

How I harbour this wish in life
At her threshold I go to reside
With all the courtesy and Kindness
Of the gateman of my heart's bride.

(xvi)

I am looking for such holidays
Nothing to do for nights and days
I should only dream about my love
With picture in heart of her embrace.

(xvii)

There is such a pressure of tears
In my eyes now, O Ghalib dear
A mighty storm is going to be released
If my cravings for her do not cease.

"'Ghalib was most outspoken, witty and straight forward specially where he did not stand to lose. He did not mind amusing the readers on his own expense. Ghalib was liberal, and catholic and secular to the core of his heart. He respected all religions and faiths and respected all others who were faithful to their beliefs."

Roshan Chaufla

غالبؔ کے ڈرامے

شوکت تھانوی

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

(دور کچھ چیزوں کے گرنے کی آواز اور میر صاحب ملازمہ کو ڈانٹتے ہیں۔)

میر صاحب:''(دور پر چیختے ہیں) لے جاؤ اسکو۔ دور ہو میرے سامنے سے۔''

گلشن:''(دوڑی ہوئی مائیکروفون کے قریب آتی ہے) ناک میں دم کر رکھا ہے ان میر صاحب نے تو اور بھی۔ ہزار مرتبہ تم سے کہا کہ آنکھیں کھول کر چیزیں دیا کر۔ بال کی کھال نکالتا ہے موا۔''

کریم:''روٹیاں لگی ہیں میر صاحب کو اور تو میں کیا کہوں۔ تو کیا سارے چائے کے برتن توڑ دیئے۔''

گلشن:''ٹرے میرے ہاتھ سے لے کر اچھال دی کہ آدھے تیتر آدھے بیٹر برتن کیوں ہیں۔ باقاعدہ سٹ میں چائے کیوں نہیں لائے۔ اللہ کی مار نہ جانے کہاں سے آمرا ہے۔ ہاتھ دھو کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔''

کریم:''صرف تمہارے ہی نہیں میرے بھی تو پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اللہ جانتا ہے گلشنؔ میں نے اس کو خود دیکھا ہے بازار کے چائے خانہ میں کنڈا ٹوٹی پیالی میں چائے پیتے ہوئے اب دماغ ہی نہیں ملتا۔ ہمارے صاحب نے کبھی آدھی بات بھی نہیں کہی۔''

گلشن:''اللہ ان کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ ایسے مالک بھی قسمت ہی سے ملتے ہیں مگر یہ تو نگوڑ مارا جان کا عذاب ہو گیا ہے۔''

کریم:''سچ پوچھو تو اس میں بھی قصور صاحب ہی کا ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس کو سیاہ سفید کا مالک بنا دیا ہے اور یہ ٹھہرا کم بخت چھچھورا، زمین پر پیر ہی نہیں رکھتا۔''

گلشن:''کل کہہ رہا تھا مجھ سے اگر میں نہ ہوں تو اس گھر کا کیا حشر ہو۔ بیرسٹر صاحب کو تو کوئی فکر ہی نہیں ہے گھر کی اور جب سے میں آ گیا ہوں وہ اور بھی بے فکر بن کر رہ گئے ہیں۔''

کریم:''جی اور کیا بھول گئے وہ دن کو چیتھڑے لگائے پھرتے تھے اور دن بھر موچی کی خوشامد کرتے تھے تو شام کو وہ قرض پر جوتیاں گانٹھ دیتا تھا۔ دعائیں دیں ہمارے صاحب کو کہ خاک سے پاک کر دیا۔''

گلشن: ''مگر یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے موا کہ صاحب نے سب کچھ اسی پر چھوڑ رکھا ہے، جانے اس نے کون سی پٹی پڑھائی ہے۔''

کریم: ''وہ تو یہ چاہتا ہے کہ صاحب کو سب بھول ہی جائیں اور اسی کو سب کچھ سمجھیں۔ اکڑ دیکھ رہی ہو آج کل ململ کے کرتے ہیں براق جیسے۔ اعلیٰ درجے کے لٹھے کے پاجامے ہیں۔ کلے میں ٹھنسی ہوئی گلوری۔''

گلشن: ''چپ رہو۔ وہ اسی طرف آ رہا ہے موا۔''

میر صاحب: ''(آتے ہوئے) صاحب یہ تماشہ کیا ہو۔ یہ لنگر ہے جناب کوئی محتاج خانہ نہیں ہے۔ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ جب آپ اپنے مالک کے سب عزیز دوست۔ میر تفضّل حسین کو۔ میرا مطلب یہ کہ مجھ کو۔ ارے بھئی دوست کہو یا عزیز کہو یا بھائی کہو، جو کچھ کہو وہ میں ہی تو ہوں ان کا۔ جب آپ لوگ مجھ کو ان برتنوں میں چائے دیں گے تو دوسروں کا تو گویا خدا ہی حافظ ہے۔ کل وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بھائی صاحب اگر یہ ملازم مناسب نہ ہوں تو دوسرے رکھ لیجئے۔ مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا ملازم میری مرضی کے مطابق ہیں اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ مجھ کو بھی سٹ میں لگا کر چائے نہیں دی جاتی۔''

کریم: ''صاحب نے خود ہی تو منع کیا تھا کہ گھر کے روزمرہ کے استعمال کے لیے سِٹ نہ نکالے جائیں۔''

میر صاحب: ''یہ غلط ہے۔ صاحب میرے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ وہ مجھ کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے اشاروں پر چلتے ہیں اور صاحب یہ واقعہ ہے کہ جتنا خیال وہ میرا کرتے ہیں اگر میرا حقیقی چھوٹا بھائی بھی ہوتا تو شاید اتنا ہی خیال کرتا، ناممکن ہے جناب کہ بغیر میرے پوچھے کوئی بات تو کر لیں۔ اور صاحب تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، میں بھی اگر بچوں کی طرح ان کا خیال نہ رکھوں تو۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

ٹیلیفون آیا ہے شاید۔ ٹھہرو۔ میں خود سنتا ہوں۔ (رسیور اُٹھا کر) ہو۔ میں بول رہا ہوں میر تفضّل حسین نقاش ہاپوڑی۔۔۔جی۔۔۔جی ہاں جی ہاں۔ میں مسٹر عبدالعزیز بار ایٹ لا کے بنگلہ ہی سے بول رہا ہوں۔ عرض کیا تا کہ میرا نام میر تفضّل حسین نقاش ہاپوڑی ہے۔ میں بیرسٹر ایٹ لا صاحب کا دوست / کہیے یا بڑا بھائی کہیے، سب کچھ میں ہی ہوں۔۔۔جی ہاں۔۔۔جی ہاں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے مجھ ہی سے فرمایئے۔ وہ بغیر میرے مشورے کے کچھ نہیں کرتے۔۔۔تو آپ۔۔۔تشریف لے آئیں۔۔۔جی۔۔۔جی۔۔۔بس یہاں آ کر پوچھ لیجئے گا میرا نام میر تفضّل حسین نقاش ہاپوڑی۔۔۔میرا ہر ایک نوکر آپ کو میرا نام بتا دے گا۔ اور جناب کا نام نامی اسم گرامی؟ جی کیا فرمایا مس فاروقی۔۔۔ یعنی مس؟۔۔۔جی۔۔۔جی۔۔۔تو آپ تشریف لے آیئے میں انتظار کروں گا آپ کا۔۔۔(ریسور رکھ کر آواز دیتا ہے) ارے بھئی

گلشن۔کریم۔''

گلشن:''(آتے ہوئے) مجھے بلایا تھا آپ نے؟

میر صاحب:''ہاں اور کریم کو بھی۔ذرا ان کو بھی بلائیے نا اگر زحمت نہ ہو تو بلکہ ٹھہرو میں خود بلاتا ہوں۔(آواز دیتا ہے) کریم۔''

کریم۔''(دور سے)،آیا جناب۔''

میر صاحب:''دیکھو بھئی گلشن۔مگر خیر۔وہ بھی آجائیں کریم تو کہوں۔''

کریم:''(آتے ہوئے) مجھے بلایا تھا آپ نے۔''

میر صاحب:''ہاں وہ بات یہ تھی کہ ابھی ایک خاتون آئیں گی۔خاتون جانتے ہو نا۔یعنی ایک عورت ہوں گی وہ مس فاروقی ان کا نام ہے وہ میرا نام لے کر پوچھیں گی کہ میر تفضّل حسین نقاش پاپوڑی کہاں ہیں تو ان کو لے کر سیدھے میرے کمرے میں آجانا اور پھر ذرا تمیز سے چائے لے کر آنا۔سمجھ گئے۔

کریم:''جی ہاں میں سمجھ گیا سٹ میں چائے لے کر آؤنگا۔''

میر صاحب:''میاں گھامڑ ہو تم تو۔چائے سے مطلب یہ ہے کہ کچھ ناشتہ بھی وہ بہت اونچے طبقہ کی خاتون ہیں میرے خاص مراسم ہیں ان سے بہت بڑے افسر کی بیوی ہیں مگر نہیں وہ تو مس ہیں۔میرا مطلب یہ کہ بہت بڑے افسر کی بیوی بننے والی ہیں نہایت ادب سے لانا میرے پاس سمجھ گئے۔''

گلشن:''جی ہاں سمجھ گئی آپ اطمینان رکھیے۔''

میر صاحب:''میں جب تک کپڑے بدل لوں تم انکے آنے کا خیال رکھنا۔''

(جاتا ہے)

کریم:''آیا وہاں سے ہاپوڑی والا بن کر پاپڑ والا کہیں کا۔''

گلشن:''یہ اب گیا ہے کپڑے بدلنے۔خضاب بھی لگائے شاید۔''

کریم:''جو چاہے کرلے نظر آئے گا وہی چڑی مار کا چڑی مار۔نفرت ہے مجھے اس شخص کی صورت سے مجھ کو تو یہ نظر آتا ہے کہ کسی دن ہو جائیں گے دو ہاتھ دو ہاتھ اس سے۔کہتا ہے مجھے گھامڑ اور خود نسلوں سے چلا آرہا ہے گھامڑ۔

گلشن:''نہ جانے مردود نے کیا جادو کر رکھا ہے۔''

کریم:''جادو کیا کر رکھا ہے۔بیچارے شریف آدمی ہیں۔یہ خود ہی سریس کی طرح آکر چپک گیا ہے۔خیر صاحب تو کچھ کہیں گے

نہیں۔مگر میں کر دوں گا مرمت اس کی کسی دن۔''

گلشن:''نوکری کی ہے عزت تو بیچی نہیں ہے کہ ایسے ایرے غیروں کی بھی باتیں سنتے رہیں۔''

مس فاروقی:''(آتے ہوئے) دیکھو بیرا۔۔۔وہ ہیں کیا نام اُن کا میر تفضّل حسین صاحب نقاش۔''

کریم:''جی ہاں ہاپوڑی صاحب۔تشریف لائیے۔گلشن تم بیگم صاحب کو پہنچا دو۔''

گلشن:''آیئے بیگم ساحب وہ اپنے کمرے میں آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔''

میر صاحب:''(آتے ہوئے) ارے کوئی ہے۔کریم۔۔۔یعنی۔۔۔اخاہ آپ؟ آپ مس فاروقی ہے۔''

مس فاروقی:''جی ہاں میرا نام مس فاروقی ہے۔''

میر صاحب:''اور میرا نام میر تفضّل حسین نقاش ہاپوڑی ہے تشریف لائیے مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی ہے آپ سے مل کر۔یعنی آپ کے چہرے پر وہ تمام ذہانت موجود ہے جو ہونا چاہیے ہر ایک پڑھی لکھی خاتون کے چہرے پر۔تشریف رکھیے۔یہ دراصل ایک قسم کا خانۂ بے تکلف ہے۔تو اب فرمایئے کہ کیسے آنا ہوا۔''

مس فاروقی:''مجھ کو اصل میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں بیرسٹر صاحب سے مشورہ کرنا تھا۔''

میر صاحب:''آپ کا مطلب ہے قانونی مشورہ؟ جی ارے بھئی مقدمہ کے سلسلہ میں جو مشورہ ہوگا وہ ظاہر ہے کہ قانونی ہی ہوگا تو کیا ہے وہ مقدمہ۔''

مس فاروقی:''اب میں آپ سے کیا عرض کروں آپ تو بیرسٹر صاحب کو میرے آنے کی اطلاع کر دیجیے میں ان سے گفتگو کر لوں گی۔''

میر صاحب:''میں آپ سے عرض کروں محترمہ کہ ابھی وہ آئے ہیں کورٹ سے بلکہ ہائی کورٹ سے صبح سے کھیل تک اُڑ کر منھ میں نہیں گئی ہے۔جب آئے ہیں تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔میں نے تو صاحب بہت ڈانٹا کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ارے صاحب جان ہے تو جہان ہے۔ایسی پریکٹس گئی بھاڑ میں کہ انسان کو نہ کھانے کا ہوش رہے نہ پینے کا۔میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر یہی کیفیت رہی تو میں بیرسٹری چھڑوا دونگا ان سے بمشکل تمام تھوڑا سا کچھ کھلا پلا کر زبردستی لٹایا ہے بستر پر کہ کمر سیدھی کر لو۔''

مس فاروقی:''تو آپ نے ناحق بلایا مجھ کو اس وقت میں پھر کسی وقت آ جاتی۔''

میر صاحب:''میں عرض کروں آپ سے محترمہ۔شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ برادرِ عزیز میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا۔بغیر میرے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے۔''

مس فاروقی:''کمال ہے صاحب۔ میں عرض کر رہی ہوں کہ یہ کوئی نجی کام نہیں بلکہ ایک قانونی مشورہ ہے۔''

میر صاحب:''وہ تو میں سمجھ گیا۔مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ آں عزیز سعادتمندی کا یہ عالم ہے کہ مقدمات بھی بغیر میرے مشورے کے نہیں لیتے، اب رات ہی کا قصہ ہے کہ ایک خون کے مقدمہ کے لیے بحث تیار کر رہے تھے اور قدم قدم پر مجھ سے مشورہ کرتے جاتے تھے۔''

مس فاروقی:''یہ تو صاحب نئے قسم کی وکالت ہے کہ وہ بیرسٹر ہو کر آپ سے مشورہ کرتے ہیں کیا آپ بھی وکیل ہیں۔''

میر صاحب:''یہ حیرت کی سب سے بڑی بات تو یہی ہے محترمہ کہ نہ میں وکیل نہ قانون کے آس پاس مگران کا خیال میرے متعلق یہی ہے کہ میں کچھ قانونی سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ جتنے مقدمات آتے ہیں۔ پہلے میں معاملات طے کرتا ہوں۔ پھر ان کو سمجھا دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف میری بات سمجھتے ہیں۔''

(بیرسٹر صاحب آتے ہوئے)

بیرسٹر صاحب:''میں سمجھا تھا آپ کہیں باہر گئے ہیں۔''

میر صاحب:''نہیں میں تو یہیں تھا۔ ذرا ان محترمہ سے کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ابھی آیا ایک منٹ میں (مس فاروقی) ذرا معاف کیجئے گا ابھی حاضر ہوا۔''

(جاتے ہیں)

بیرسٹر صاحب:''(سرگوشی میں) کون ہیں یہ۔''

میر صاحب:''تم چلو اپنے کمرے میں میں ابھی آیا ان سے بات کر کے شاید طے ہو جائے۔ان کو تیار کر رہا ہوں کہ مقدمہ چلا دیں اور تم کو اپنا وکیل بنالیں۔''

بیرسٹر صاحب:''مگر یہ ہیں کون۔''

میر صاحب:''میں ابھی ان سے بات کر کے ساری تفصیل بتا دونگا۔تم چلو نا۔ اپنے کمرے میں (جاتے ہیں، پھر مائیکروفون کے قریب آتے ہوئے) ہاں ہاں میں سب طے کیئے لیتا ہوں۔''

مس فاروقی:''اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو یہی تھے بیرسٹر صاحب۔''

میر صاحب:''جی ہاں یہی ہیں عزیز القدر میاں عزیز بار ایٹ لا۔ میں نے آپ کا ذکر کیا تھا تو کہنے لگے کہ بھائی صاحب آپ ہی طے کر لیں۔تو میں پوچھتا ہوں کہ مقدمہ کی نوعیت کیا ہے۔''

مس فاروقی: ''مقدمہ کی نوعیت یہ ہے کہ''

میر صاحب: ''ٹھہریئے میں ذرا چائے منگا لوں پھر اطمینان سے بیٹھ کر سنوں''۔

مس فاروقی: ''جی نہیں میں چائے نہیں پیونگی۔''

میر صاحب: ''صاحب سخت شکایت ہوگی مجھے۔ بخدا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ مجھ کو کس قدر مسرت ہوئی ہے آپ کے یہاں آنے سے اور میاں عزیز بھی کہیں گے کہ میں نے چائے تک کو نہ پوچھا (آواز دیتا ہے) ارے کریم۔''

کریم: ''(آتے ہوئے) آیا صاحب۔ (قریب آکر) مجھے بلایا۔''

میر صاحب: ''بھئی عجیب بیہودہ ہو تم۔ چائے کے لیے جو کہا تھا۔''

کریم: ''چائے کے لیے تو کہا تھا مگر بیہودہ کیا ہوتا ہے۔ زبان ہی قابو سے باہر ہے۔''

میر صاحب: ''کیا مطلب یعنی یہ تم مجھ سے بات کر رہے ہو میر تفضّل حسین نقاشی ہاپوڑی سے۔ مجھ کو تم نے سمجھا کیا ہے۔''

کریم: ''سب کچھ سمجھ چکا ہوں اور بہت غم کھایا۔ ذرا زبان کو لگام دیکر بات کیا کرو۔ وہی مثل کہ منھ لگائی ڈومنی گائے تال بے تال۔''

میر صاحب: ''سخت گستاخ ہو تم۔ نکل جاؤ یہاں سے یعنی یہ مجھ سے بات کر رہے ہو۔ جانتے ہو کون ہوں میں۔''

کریم: ''اجی خوب جانتا ہوں دعا دو صاحب کو ورنہ تم تھے ہی کیا۔

وہی مثل کہ ؎ بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

میر صاحب: وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

یعنی میری کچھ آبرو ہی نہیں۔ ذرا سن لیجیئے مس فاروقی اس پاگل کی بات ابھی بتاتا ہوں تم کو کہ میری آبرو کیا ہے۔ خبر لیتا ہوں تمہارے صاحب کی جن کے تم ملازم ہو۔ ٹھہریئے گا ذرا مس فاروقی میں ابھی آیا۔''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گوشہ غالبؔ سرائی

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی ''غالبؔ سرائی''

تحریر: نسیمِ سحرؔ

مرزا اسداللہ غالبؔ نے تو ایک بار زمانے کی ناقدری کے زیرِ اثر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں''، مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ غالبؔ کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ تازہ ترین مثال پروفیسر کلیم احسان بٹ کی تحقیقی کتاب ''غالبؔ سرائی'' ہے جو غالبؔ کے بارے میں تقریباً چھیاسی اہلِ قلم کے منظوم خراجِ عقیدت پر مشتمل ہے، اور جو حال ہی میں ایک اور پرستارِ غالبؔ اور معروف ناشر شاعر علی شاعر کے ادارے رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی سے عمدہ کاغذ اور گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ چونکہ راقم السطور بھی اِن دنوں مرزا غالبؔ کی غزلیہ زمینوں میں شعرائے کرام کی کہی گئی نعتوں پر مشتمل ایک کتاب مرتّب کر رہا ہے اس لیے اس کے لیے اس کتاب کی اہمیت کئی حوالوں سے دو چند ہو گئی ہے۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ کا شمار ان معدودے چند اہلِ فکر و دانش میں ہوتا ہے جو کسی صلے اور ستائش کی تمنا سے دور رہ کر اپنے آپ میں اور تخلیق و تحقیق کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ تا حال ان کے پانچ شعری مجموعے نقادانِ فن سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں، ان کی وجہ شہرت محض شاعری نہیں بلکہ ان کا تحقیقی و تنقیدی کام بھی بڑا منفرد انداز کا اور اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کئی تنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ فروغِ ادب کے حوالے سے بھی وہ ہمہ وقت سرگرم رہتے ہیں، جب راولپنڈی میں تھے تو گورنمنٹ ڈگری کالج میں آئے دن کوئی نہ کوئی محفل برپا رکھتے تھے، اب جلالپور جٹاں جیسے نسبتاً مضافاتی علاقے کے کالج میں بطور پرنسپل تعینات ہیں تو وہاں بھی کسی نہ کسی بہانے تقریبات کا سلسلہ چلاتے رہتے ہیں، حال ہی میں دو روزہ ادبی کانفرنس اور کتاب میلہ کا انعقاد اس کی روشن مثال ہیں۔ کتاب سے ان کا عشق کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

''غالبؔ سرائی'' کے پیش لفظ میں مرتّب پروفیسر کلیم احسان بٹ نے انکشاف کیا ہے کہ غالبؔ سے ان کی دلچسپی کا آغاز دورانِ تعلیم ہی میں ہو گیا تھا اور غالب کے متعلق لکھی گئی کتب، غالب کے کلام کی تشریحات، غالب کی زمین میں کہی گئیں غزلیں، غالب کے انگریزی تراجم، غالب کی شان میں کہی گئی شاعری، غالب کے خطوط، کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس نے انہیں متاثر نہ کیا ہو۔

انہوں نے کافی عرصہ اس پہلو پر بھی تحقیق کی کہ مزاح نگار نثر نگاروں پر غالبؔ کے اثرات کیا ہیں، اسی تلاش اور تحقیق کے دوران ان کے پاس بہت سا مواد جمع ہوتا گیا۔ اب "غالب سرائی" اسی مواد کے کچھ حصے کی تالیف و ترتیب کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

غالبؔ پر شعرائے کرام کے شعری اظہار کا سلسلہ غالبؔ کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ان کی مقبولیت و شہرت کا یہ عالم تھا کہ ان کی وفات پر بھی شعراء کی ایک بڑی تعداد نے تاریخِ وفات کہی، غالب کی زمینوں میں غزلیں کہنے، غالب پر نظمیں کہنے ،اور غالبؔ کی زمینوں پر مزاح نگار شعراء کے مزاحیہ کلام کا سلسلہ تب سے جاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر چھوٹے بڑے شاعر نے کسی نہ کسی طرح غالبؔ کو موضوع بنایا ہے۔ اس لحاظ سے پروفیسر کلیم احسان بٹ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ غالب وہ خوش قسمت شاعر ہے جس نے نہ صرف حیاتِ جاوداں پائی بلکہ اس کے اپنے زمانے نے بھی اسے نظرانداز نہیں کیا۔۔ان کے مخالفین کی طرح ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بھی کم نہیں تھا۔۔۔چنانچہ ۱۵رفروری ۱۸۶۹ء کو وفات کے سو سال بعد بھی غالبؔ مقبولیت کے اس عروج پر تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں بیک وقت جشنِ غالبؔ منایا گیا۔"

یہاں راقم السطور یہ اضافہ کرتا چلے کہ اسی سلسلے میں جب بہت پہلے غالبؔ صدی منائی گئی تو ہندوستان کے ایک معروف شاعر منظر بھوپالی نے کہا تھا 'وہ صدی تمہاری تھی ، یہ صدی ہماری ہے'، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ یہ صدی بھی غالبؔ کی ہے، اور شاید آیندہ آنے والی صدیوں میں بھی سب سے بڑا شعری حوالہ غالبؔ ہی ہو۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی اس کتاب میں شامل شعراء کی شاعری کئی عشروں پر پھیلی ہوئی ہے اور غالب سرائی کا یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے۔ کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی غالبؔ کے نام پر دنیا بھر میں کئی ادارے اور انجمنیں قائم ہیں۔ سینکڑوں غالب شناس غالبؔ پر لکھ کر شہرت و نام کما چکے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ "غالبیات" کے عنوان سے باقاعدہ ایک مضمون کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہو چکا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکانی و زمانی طور پر کسی جگہ اور عہد میں قید نہیں ہے بلکہ اس میں وہ تمام شعراء شامل ہیں جو ہر اس جگہ مقیم ہیں جہاں اردو بولی جاتی ہے۔ اسی طرح پروفیسر کلیم احسان بٹ جیسے عمدہ غزل گو شاعر نے یہ تنقیدی و تحقیقی لچک بھی دکھائی ہے کہ غالبؔ سرائی میں انہوں نے محض غزل گو شعراء کا کلام شامل کرنے کی بجائے تمام اصنافِ شعر پر مبنی کلام پیش کیا ہے جن میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترکیب بند، سانیٹ، آزاد نظم، نثری نظم سمیت تمام متنوع شکلیں موجود ہیں، ان تمام منظومات کی شمولیت کسی زمانی ترتیب یا عمروں کے لحاظ سے کرنے کی بجائے الفبائی رکھی گئی ہے جس سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

کتاب میں شامل تخلیقات کی تعداد ۸۶ ہے جنہیں پھولوں کے ایک خوشبودار اور رنگ دار گلدستے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے، اس کے دیباچہ نگاروں میں ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، اکرم کنجاہی اور سید روح الامین جیسے معروف نام شامل ہیں جبکہ ناشر اور شاعر شاعر علی شاعر نے بھی ایک خوبصورت تحریر فلیپ کے طور پر شامل کی ہے۔ تین سو چار صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس عمدہ گیٹ اَپ اور کاغذ کے ساتھ شاعر علی شاعر نے شائع کی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ سرائی میں عملاً وہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

ایک دیباچہ نگار ڈاکٹر فہمیدہ تبسم نے اس کتاب کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب لکھا ہے: ''مطالعاتِ غالب کے حوالے سے پروفیسر صاحب کی یہ تحقیقی کاوش نہ صرف غالبؔ جیسے ہر عہد میں غالب شاعر کا اعترافِ عظمت ہے بلکہ غالبؔ فہمی کے نئے اور منفرد رجحان کا خوبصورت نمونہ بھی ہے، غالبؔ کی شعری وفکری قدر ومنزلت کے ضمن میں منظوم کلام کی تلاش آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے جس محنتِ شاقہ، طلب اور جستجو کی ضرورت تھی پروفیسر کلیم احسان بٹ اس کے لیے موزوں ترین مزاج کے حامل دانشور ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ جیسا کوئی دوسرا شاعر اپنی شعری کائنات میں اتنے امکانات سمیٹے ہوئے نہیں ہے۔ ان کے کلام پر تنقید وتحقیق کے جس کام کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کیا تھا اس کے بعد بیسیوں محققین، ناقدین اور شارحین نے نظم ونثر کی صورت میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ ''غالبؔ سرائی'' کے ذریعے اس قابلِ قدر کوشش کا ایک نمایاں حصہ بن گئے ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں انہوں نے غالبؔ پر ہونے والے تحقیقی وتوصیفی کام کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ اس موضوع پر ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ہے۔ اسی لیے محقق نقاد اور شاعر اکرم کنجاہی نے بھی اپنے دیباچے میں پروفیسر کلیم احسان بٹ کی کاوشوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور اس کتاب کو تنقیدی اور 'غالبیاتی' حوالے سے اہم ٹھہرایا ہے۔ دیباچہ نگار سید روح الامین نے بجا طور پر کہا ہے کہ ''غالبؔ پر نئی کتاب یا مقالہ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اس کے بعد مزید لکھنے کی گنجائش نہ ہوگی، لیکن اہلِ نظر کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ یوں غالب پر خامہ فرسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فکر ونظر اور افکار وتصورات کے لحاظ سے غالبؔ شجرِ سایہ دار کی صورت اختیار کر چکے ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے''۔

غالبؔ پر خامہ فرسائی کے چند منتخب نمونے اس کتاب میں سے قارئین کے ذوقِ شعری کی تسکین کے لیے پیش کئے جا رہے ہیں:

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ و ہم شیشہ و ہم نکہت و ہم رنگ
تو نظم میں بھی ، نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

جگر مرادآبادی

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رَسائی تا کجا
تھا سراپا رُوح تُو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا،محفل سے پنہاں بھی رہا

علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ

نوکِ خامہ ہے تری زخمۂ سازِ عرفاں
کہ نوا ریز ہے ہر صفحۂ دیواں تیرا

خلیفہ عبدالحکیم

اگر یہ سچ ہے الفاظ روح رکھتے ہیں
تو یہ بھی سچ ہے وہ الفاظ کا مسیحا ہے

دلاورفگار

غالبؔ شیوہ بیاں تھے محسنِ اردو زباں
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جن کی عظمت کے نشاں

احمد علی برقی اعظمی

ترا کلام سند ہے زمانے بھر کے لیے

نہ کوئی جھول ہے اس میں نہ اشتباہِ خیال

باقی احمد پوری

غالبؔ یہ ایک بات مری لاکلام ہے

تیرے بغیر ذکرِ سخن ناتمام ہے

ناصر بشیر

''غالب سرائی'' میں سے درجِ بالا منتخب کلام سے قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ مرزا غالبؔ ہر عہد کی طرح آج کے عہد میں بھی اسی طرح مقبول و معروف ہیں بلکہ ان کی شعری کائنات میں سے نئے معنی تلاش کئے جا رہے ہیں کہ بلاشبہ اس کی شاعری گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: جنید آصف (سال دوم)

سُنّی مُسلمان

رمضان کا مہینہ تھا مولوی عبدالقادر دہلوی مرزا سے ملنے آئے۔ عصر کا وقت تھا مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا۔ جناب کا روزہ نہیں ہے۔ مرزا نے کہا سُنّی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔''

(اسداللہ خان غالبؔ)

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی "غالب سرائی" پر ایک نظر

ڈاکٹر زاہد حسین چغتائی

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی گراں قدر تالیف "غالب سرائی" موصول ہوئی، کتاب کیا ہے، غالبیات کے آئینے میں ایک مربوط عہد کی بازگشت ہے۔ مرزا اسداللہ غالب نے جتنی جانان زندگی گزاری، اس سے کہیں زیادہ ان کے ہم عصروں اور ان کی شاعری سے متاثر ہونے والے شعراء اور محققین نے اپنے اپنے پیرائے میں انہیں خراج پیش کیا۔ ان افراد کی مساعی جمیلہ کا ہی اعجاز ہے کہ موجودہ عہد بھی غالب کے شعری سحر سے نہیں نکلا۔ اس صورت حالات میں صاف ظاہر ہے کہ مستقبل کی آنے والی صدیاں بھی غالب ہی کی مرہون منت ہوں گی۔ اس تناظر میں پروفیسر کلیم احسان بٹ نے بڑا با توفیق کام کیا کہ غالبیات کی کہکشاں کو اکٹھا کر کے صاحب نظر عہد کے سپرد کیا۔ اس بڑے کام پر انہیں جتنا بھی خراج پیش کیا جائے کم ہے۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ نے زیر نظر کتاب کے کینوس پر غالب کے شعری پرستاروں کو یکجا کرنے میں جس قدر عرق ریزی سے کام کیا، اس کا اندازہ وہی ماہرین غالبیات کر سکتے ہیں جو شعر غالب کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر موتی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اقبال رح نے کہا تھا؛

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس و خاشاک

پروفیسر کلیم احسان بٹ سے میری کوئی ڈیڑھ دھائی سے یاد اللہ ہے، میں ان کے تحقیقی اور تخلیقی کینوس کو جانتا اور سمجھتا ہوں، اس میں غالبیات کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ ہمہ تن میدان غالب کے شہسوار ہیں، اس سے پیشتر ان کے غالب بارے متعدد مقالات و مضامین شائع ہو چکے ہیں ایک کتاب بعنوان "مقالات کلیم" میری نظر سے گزر چکی ہے جس کا غالب موضوع بھی غالب ہے۔ یہ ان کے مختلف ادبی و تحقیقی پرچوں میں غالبیات کے نوع بہ نوع مضامین ہیں، اس کتاب میں، میں نے انہیں ایک ماہر غالبیات کی طرح کئی تحقیقی گتھیاں سلجھاتے ہوئے دیکھا، اس کے علاوہ بھی ان کا غالب کے حوالے سے گراں قدر مطبوعہ تخلیقی و تحقیقی کام موجود ہے، لہٰذا اس حوالے سے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہمارے ہاں معدودے چند ماہرین غالبیات میں

پروفیسر کلیم احسان بٹ کا نام نمایاں اور مقتدر ہے۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، اب وہ غالب پر طبع آزمائی کرنے والے نثر نگاروں کی ایک مربوط کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ یہ بھی بڑے معرکے اور توفیق کا کام ہے، جس کا بیڑہ پروفیسر کلیم احسان بٹ نے اٹھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے عہد کا ادبی مورخ ببانگ دہل لکھے گا کہ کلیم احسان بٹ ایسے بلند قامت محقق اور مؤلف ہیں، جنہوں نے غالب کی شعری اور نثری جہات کا اپنے انداز سے احاطہ کرنے میں پوری صلاحیتوں سے کام کیا اور ایک مستند ادبی تاریخ مرتب کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: محمد ابوبکر (سال چہارم)

آم کی خوبی

مولانا حالؔی لکھتے ہیں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک مجلس میں جناب مرزا صاحب بھی موجود تھے آموں کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی رائے میں آم کیسا ہونا چاہیے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ یہ سُن کر سب سامعین ہنس پڑے۔

(اسداللہ خان غالبؔ)

غالبؔ سرائی ''کلیم احسان بٹ'' کی مرتب کردہ سوغات

پروفیسر ڈاکٹر مظہر اقبال

صاحبانِ علم و دانش کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے۔ ایسے تحائف جن کی خیر و برکت دائمی ہوتی ہے۔ جن کی مہک ازلی ہوتی ہے۔ یہی مہک روح کی تسکین اور ذہن کی زرخیزی کا باعث بنتی ہے۔ کلیم احسان صاحب کا دوستوں پر یہ احسان کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انہیں ادبی سرگرمیوں سے منسلک رکھنے کے ساتھ ساتھ ادبی رفاقتیں بڑھانے کا اختصاص بھی رکھتے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہوں اِن کا قلم گلہائے رنگا رنگ کی بہار کا منظر پیش کرتا رہتا ہے۔ شاعری، تنقید، تحقیق ان تینوں اصناف میں ان کا نام ایک مقام کا حامل بن چکا ہے۔ غالب سے انہیں رغبت ہی نہیں بلکہ نسبت ہے اور نسبت بھی عشق کی حد تک، متاثر تو وہ میر اور ناصر سے بھی ہیں لیکن غالب کو اپنے اُوپر ایسے غالب کیا ہوا ہے کہ باقی تمام جہات اس ایک خاص جہت میں ڈھلتی اور پلتی دکھائی دیتی ہیں۔

''غالب سرائی'' غالب سے اس عشق کا اظہار ہے جس کا تذکرہ مقالات کلیم میں بھی ملتا ہے، اشعار کلیم میں بھی اور شعارِ کلیم میں بھی ''کلیم'' میر کی اداسی سے بھی لگا کھاتے ہیں اور غالب کے کھنڈرے پن اور انانیت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ ایسی بوقلمونی ہے جو انہیں بہت سے مراحل میں تر و تازہ بھی رکھتی ہے اور تازہ کار بھی غالب ''غالب سرائی'' ان کی تازہ کاری کا دلکش نمونہ ہے۔ غالب سرائی گویا غالب کے چاہنے والوں سے ایسا تعارف ہے جس سے ہم بیک وقت طالب و مطلوب دونوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ ''غالب سرائی'' معارف غالب بھی ہے اور معارف غالبین بھی، یہ ایک ایسا وقیع سرمایہ ہے کہ جس سے غالب کا کوئی بھی چاہنے والا ایک حد تک اس معاملے میں ثروت مند ہو سکتا ہے۔ یہاں آپ آلِ احمد سرور کے اندازِ فکر میں، ''فکر غالب'' کو یوں سمجھ لیتے ہیں جیسے کسی بہت بڑے دبستان کی فکری، تہذیبی اور تحریکی کاوشوں کو چند الفاظ میں ایسے پرو دیا گیا ہو جیسے کسی شہر کے اُونچے بُرج یا مینار اس شہر کی قد و قامت، استقامت اور صحافت کا احاطہ کر رہے ہوں، آیئے ہمارے دعوے کی تائید تا تصدیق میں شامل ہو جایئے۔۔

اس کے اک معجزۂ فکر و نظر کے آگے
سرنگوں اہل سیاست کے سبھی لات و منات

کلیم صاحب نے خوش دلی سے محبت اور عقیدت کی فراوانی سے جو معتقدین غالب کا ''انسائیکلو پیڈیا'' غالب سرائی کی

صورت میں ہم تک پہنچایا ہے اس سے ہم بہ آسانی غالب کے ان گوشوں سے واقف ہو سکتے ہیں جو اندھیرے میں تو نہیں تھے لیکن ایسی چکا چوند میں بھی نہیں تھے۔ جس تک رسائی ''غالب سرائی'' کی صورت میں ممکن ہوئی ہے۔ ''مدح غالب'' کا یہ سلسلہ صرف مدح تک محدود نہیں بلکہ اس مجموعہ میں بہت سے ایسی کٹیلی تحریریں بھی ہیں جن سے تنقید کا نشتر وہ چبھن اور کسک عطا کرتا ہے جس کی طلب اس راہ میں ہر ذی وقار قاری محسوس کرتا ہے۔ کلیم صاحب نے غالب کے چاہنے والوں کی ایسی محفل سجائی ہے جس کے شرکاء وسیع المشرب بھی ہیں اور وسیع القلب بھی۔ پاکستان ہندوستان دونوں سے ایسے ایسے شعراء نے غالب کی توصیف اور غالب فہمی میں اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے کہ اُردو اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے اس ''غالب سرائی'' کو اپنے دل کے قریں محسوس کریں گے۔ یہ کتاب کتب خانوں اور لائبریریوں میں سوئے گی نہیں بلکہ بیدار رہے گی، تحقیقی سطح پر اس کتاب کی اہمیت یہ ہوگی کہ اس میدان میں جب بھی غالب پر بات ہوگی ''غالب سرائی'' کے بغیر ادھوری رہے گی۔ یہ کتاب سنجیدگی اور شگفتگی دونوں کا امتزاج ہے، کیوں نہ ہو جب ممدوح میں یہ خصائص موجود تھے تو مدح خواں کیسے اس سے پہلو تہی کر سکتے تھے، ہم تو یہ کہیں گے کہ ''غالب سرائی'' غالب کو اس تناظر میں دکھاتی ہے جو جدیدیت اور ماحولیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ تناظر ہے، اس سلسلے میں سید محمد جعفری کی نظم ''مرزا غالب فلم سازوں میں'' ہماری مدد و معاون ہوسکتی ہے، پوری نظم تو یہاں تحریر کرنا معیوب دکھاتی دیتا ہے چند ایک اشعار پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

پہلے مرزا نے یہ سمجھا کہ میں جنات میں ہوں
فلیش لائٹ جو پڑی بولے طلسمات میں ہوں
پھر اندھیرا ہوا کہنے لگے ظلمات میں ہوں
مبتلا اپنے گناہوں کی مکافات میں ہوں

ایسے ہونے سے تو اچھا تھا نہ ہونا غالب
''آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب''

فلم بننے کا مگر کوئی نہ امکاں نکلا
''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا''

کیا زمانہ ہے یہ کیسی سخن آرائی ہے
''ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے''

کون کر سکتا ہے اُردو سے وفا میرے بعد
''بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد''

مولانا الطاف حسین حالؔی اور اقبالؔ نے جس انداز میں حضرتِ غالبؔ پر خامہ فرسائی کی ہے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ایسی شاہکار تحریروں کو پڑھے بغیر غالب داں ہونے کا دعوی کس حد تک معتبر ہوسکتا ہے؟ مولانا حالؔی نے جس اخلاص سے غالب کا مرثیہ رقم کیا ہے گویا غالب کو قارئین کے دلوں پر مرتسم کر دیا ہے۔ غالب کی وہ جھلک وہ چھب دکھائی ہے کہ دل ہی جانتا ہے کس ضبط سے ضبط کرنا پڑتا ہے۔ یہ غالب کا ایسا تعارف ہے جو'' غالب سرائی'' کا خاصہ ہے اور غالب سرائی کی'' منہاج بھی

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد

علامہ اقبالؔ جب غالب کے بارے میں کہتے ہیں:

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

تو آپ با آسانی غالب کے ان نظریات تک پہنچ جاتے ہیں جن سے کلام غالب کی آبرو ہے۔ جو غالب کی شاعری کا مغز ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کلیم صاحب نے جن مداحین کو یکجا کر دیا ہے'' غالب سرائی'' کی صورت میں اُن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے زاویے سے غالب کو ضرور دیکھا ہے لیکن ہمیں غالب ویسا ہی دکھایا ہے کہ زاویہ غالب ہی ہم پر غالب رہا اور اس سلسلے میں کوئی آڑ یا دراڑ سامنے نہیں آئی جس سے کوئی رخنہ پیدا ہوتا ہو۔ یہ غالب سے سچی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ اعتدادِ زمانہ سے غالب آشنائی میں کوئی جھول نہیں آیا۔ اسی کی سادہ سی وجہ یہی ہے کہ مشاہیر نے اس شہرۂ آفاق ہستی کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی کاوشوں سے سخن فہموں کے درمیاں اس کی موجودگی کو مزید تابناک بنایا، عرش ملسیانؔی، احسان دانشؔ، ساحر لدھیانوی، محسن احسان، سیماب اکبر آبادی، گلزار، مخدوم محی الدین وغیرہ جیسے نابغۂ روز گار شعرا نے'' غالب سرائی'' کی مجلس کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ مختلف اصناف میں اور ہستیوں کا غالب پر لکھا گیا کلام کلیم احسان صاحب نے یکجا کر کے گویا گیسوئے اُردو کو بھی چمک دمک بخشی ہے اور اسے منتِ پذیر یشانہ کے مرحلے سے کمر کی طرف لپکنے اور بڑھنے کی تھپکی دی ہے۔ یہ ایسی کامیاب تھپکی ہے ہر پڑھنے والے کا دل اُردو کے گال سہلانے کے لیے بے تاب ہوتا دکھائی دیتا ہے اور بے تاب وہی ہوتا ہے جس میں کچھ کر گزرنے کی تاب ہو تو جان لیجئے کہ کلیم صاحب جیسے ادیب، جب تک اُردو کو میسر ہیں اس کے حسن فراواں کی صف میں کوئی صف شکن گھس پائے گا، کلیم صاحب کی'' غالب سرائی''، مکمل بہار ہے، موسم کا جوبن اور فطرت کا نکھار ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''غالب سرائی''

ڈاکٹر نعیم گھمن

پروفیسر کلیم احسان بٹ سے میری شناسائی اس وقت ہوئی جب میں پی ایچ ڈی کا تھیسز کر رہا تھا۔ میں نے ان کی کتاب جو کہ گجرات کی شعری روایت کے متعلق تھی اس سے استفادہ کیا تھا۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ سے میرا دوسرا حوالہ میرے شعبہ اردو گورنمنٹ شالیمار کالج باغبانپورہ لاہور کے سنئیر استاد جناب پروفیسر جاوید صاحب بھی ہیں۔ جاوید صاحب کلیم احسان بٹ کے دوست ہیں۔ ان کا ذکر ہمارے شعبے میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ کے کئی شعری مجموعے اور تحقیقی کتب شائع ہو چکی ہیں۔

انہوں نے مجھے اپنی کتاب غالب سرائی از راہ محبت بھیجی تو دل خوش ہوا۔ حضرت غالب ہر دور میں معتبر رہے۔ غالب وہ خوش قسمت شاعر ہے جس کو ہر دور میں پذیرائی ملتی رہی ہے۔ کلام غالب کی شرح۔ اس کے فکر وفن پر خاصا کام ہو چکا ہے۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ نے حضرت غالب کو خراج تحسین پیش کرنے کا انوکھا انداز اپنایا۔ وہ معروف شعرا جنہوں نے غالب کی منظوم مدح کی ہے۔ ان کے منظوم خراج عقیدت کو یکجا کر کے۔ غالب سرائی۔ کی صورت میں چھاپا ہے۔ یہ کام عرق ریزی کا متقاضی تھا۔ غالب کی مدح سرائی اور پھر وہ بھی منظوم۔ اس کو تلاش کرنا۔ یکجا کرنا اور شائع کرنا یقیناً اک اہم تحقیقی کام ہے۔ اس کتاب میں غالب کو خراج تحسین پیش کرنے والے چھیاسی شعرا کا کلام درج ہے۔ آل احمد سرور سے لیکر وقار جلیل تک عشاق غالب کا کلام اک جگہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔

اب آپ محبان غالب کا انداز ملاحظہ کریں

خوبی جو میر میں ہے وہ غالب میں بھی ملی
غالب میں جو ہے بات مگر میر میں کہاں

بٹ صاحب نے کتاب کا نام کتنا ہی بھلا رکھا ہے کیونکہ غالب نے خود کہا ہے۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

مدح غالب میں چند اہم شعر جوان کی کتاب سرائی سے ماخوذ ہیں

غالب شیوہ بیاں تھے محسن اردو زباں
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جن کی عظمت کے نشاں

احمد علی برقی اعظمی

عرفی و نظیری و ظہوری و فغانی
تیرا کوئی ہم سر نہ تیرا کوئی ہم آہنگ

جگر مرادآبادی

غالب ترا کلام نوائے سروش ہے
الہام غیب و نغمہ ساز خموش ہے

چندر بھان کیفی دہلوی

دلاور فگار کے مزاحیہ اشعار کا تڑکا بھی کتاب میں شامل ہے۔

جو کہہ رہے ہیں کہ غالب ہے فلسفی شاعر
مجھے بتائیں کہ بوسہ میں کیا فلسفہ ہے
شراب جام میں ہے اور جام ہاتھوں میں
مگر یہ رند بلا نوش پھر بھی پیاسا ہے

یاد غالب اک پیام عیش بن کر آگئی
رات کی تاریکیوں میں نور بن کر چھاگئی

عزیز اندروی

بہرحال غالب شناسی کے لیے یہ کتاب بڑی اہم ہے۔اس کی اشاعت پر پروفیسر کلیم احسان بٹ کی محنت شاقہ کو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ صاحب شکریہ آپ نے اک اہم کتاب مجھے بھیجی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"غالبؔ سرائی" پر ایک نظر

شیخ عبدالرشید

چمنستان غالبؔ کی سیر کئے بغیر اردو ادب کا ہفت خواں طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کو قدرے تمثیلی پیرائے میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب ایک دیو ہے جس کی جان غالبؔ کی شاعری میں قید ہے۔ غالبؔ کی شاعری کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہے کہ ان کے بعد کے ہر بڑے شاعر پر اس کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری میں اردو شاعری کا سارا جوہر سمٹا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر غزل اردو شاعری کی آبرو ہے تو غالبؔ کی شاعری اردو غزل کی آبرو سمجھی جاتی ہے۔ اردو شعراء غالبؔ کے آستانے پر جبہ سائی کئے بغیر اپنے ادبی سفر کا آغاز کر ہی نہیں سکتے۔ گجرات کے ادبی افق کے روشن ستارے پروفیسر کلیم احسان بٹ ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں . ماہر تعلیم، متحرک منتظم، شاعر، محقق اور نقاد ہیں . ان کی ایک قابل تحسین شناخت غالب پسندی اور غالب شناسی ہے. غالبیات ان کے ذوق پر غالب ہے اس لیے انہوں نے مرزا اسد اللہ کی شخصیت و خدمات کی کئی جہتوں کو قلمبند کیا . غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس کے بنیادی معاملات ومسائل پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ اور نظام کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اُن کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ لیکن جس طرح ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار وابلاغ ہوا ہے۔ وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب کی شاعری کا اثر حواس پر شدت سے ہوتا ہے وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اسی ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار وابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ ان گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔ برادرم پروفیسر کلیم احسان بٹ پرنسپل گورنمنٹ عبدالحق ایسوسی ایٹ کالج جلالپور جٹاں کی مرتبہ نئی کتاب " غزل سرائی" (غالب پر لکھی گئی منظومات کا مجموعہ) فروری میں رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی نے شائع کیا۔ انہی دنوں جناب کلیم احسان نے کتاب کا تحفہ بھیجا جو مجھ تک پہنچتے ہی کسی اور ہاتھ میں چلا گیا۔ ہفتے کے روز کلیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے محبت کے ساتھ ایک نسخہ عطا کیا جس پر ممنون احسان ہوں۔ یہ کتاب مرتب کی

غالب فہمی کا روشن حوالہ ہے 86 کے لگ بھگ شعراء کی غالب سرائی کا شاندار مجموعہ جو ادبی حلقوں سے خوب ستائش حاصل کر چکا ہے۔ دیدہ زیب کتاب کی اشاعت پر ایکبار پھر مبارکباد اور ان کی اگلی کتاب کے لیے ڈھیروں نیک تمنائیں.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: عمران نذیر (سال دوم)

گدھا آم نہیں کھاتا

حکیم رضی الدین خان جو مرزا صاحب کے نہایت گہرے دوست تھے۔ ان کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن ''مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا مرزا نے کہا ''بے شک گدھا آم نہیں کھاتا۔''

(اسداللہ خان غالبؔ)

کلیم احسان کی غالبؔ شناسی کا مظہر

: تفاخر محمود گوندل

جو اہلِ دل خدائے ذوالمنن کو یاد رکھتے ہیں　　　وہ اپنی موت کو گور و کفن کو یاد رکھتے ہیں

اُنہیں کس طرح مستقبل نظر انداز کر دے گا　　　جو گہرائی دل سے اہلِ فن کو یاد رکھتے ہیں

کسی محترم و محتشم و مقدس جگہ یا کسی لا مثال و رفیع انسان شخصیت کے ساتھ اظہارِ محبت کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔اس ضمن میں کوئی خورشید خطابت کے طور پر اُفقِ دہر پر ضیا پاشیاں کرتا ہے۔کوئی قرطاس و قلم کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوئے قلوب و اذہان آدمیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔کوئی عروض پر یدِ طولیٰ رکھتے ہوئے بحور و قوافی سے کھیلتا ہوا جواہر آبدار بکھیرتا ہے۔کوئی اپنی ممدوح ہستی کے افکار کو سمیٹ کر انہیں منصۂ مشہود پر جلوہ گر کر دیتا ہے۔برصغیر پاک و ہند میں یوں تو میدانِ شعر گوئی میں بڑے بڑے شعرائے عظمت مرام نے اپنے اوجِ تخیل کا سکہ جمایا کہ اہلِ فن آج تک اُن کے تتبع میں احساس فخر و مباہات سے زمینیں منتخب کر کے اپنے ذوق کا اظہار کرتے ہیں۔مگر دیوانِ غالب کی شان ہی نرالی ہے۔فقط ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مگر بلیغ کتاب نے دنیا بر کے جوئندگانِ علم اور جستجو یانِ ادب کو اپنا دیوانہ اور گرویدہ بنا رکھا ہے۔اربابِ فہم و فراست اور حلقہ ہائے دانش و تدبر کوچہ غالب شناسی میں تلوے سہلاتے نظر آتے ہیں اور حضرتِ غالب کے کسی ایک شعر کے کسی ایک مصرعے کی تفصیحات میں فرحت و طمانیت محسوس کرتے ہیں مثلاً "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا" "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" اس ایک شعر نے ہی اقلیم ادب کے شہنشاہوں کے بحرِ تصور میں طلاطم بپا کر رکھا ہے۔

صاحبانِ ذی شعور اپنے اپنے انداز میں اس کی تشریح میں مصروفِ فکر ہیں۔اسی طرح میدانِ نعت گوئی میں مداحینِ منبع الانوار اور ثنا گسترانِ محبوبِ کردگار صبح و مسا بارگاہِ رسالت مآب گُل ہائے عقیدت پیش کر رہے ہیں اور تا ابد کرتے رہیں گے۔مگر غالب کی کلک گہر بار نے صفحۂ قرطاس پر ایک ایسا نادرُ الوجود اور عدیم المثال شعر رقم کر دیا جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ورائے دیگر است کے مقام پر ایک مرقع تاج کی صورت تابندہ نظر آتا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کلک ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

مراد یہ ہے کہ جس رب ذوالمنن کے سحابِ کرم نے اپنے محبوب مکرم کو بے مثال رفعتیں، شانیں، کمالات اور علم کی بے کرانیاں مرحمت فرمائی ہیں اُسی کا کلامِ بلاغت نظام ان اوصاف کو صحیح طور پر بیان کر سکتا ہے۔ ورنہ شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی جیسے وحیدالعصر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کلامِ غالب کا بالاستعیاب اور بنظرِ عمیق مطالعہ کیا جائے تو آدمی کا ذہن آسمانِ حیرت کی جانب پرواز کرنے لگ جاتا ہے جہاں بھی غالب رُکتا ہے نکتہ آفرینیوں کا مینا بازار سج جاتا ہے جہاں بھی اُن کا قلم محوِ خرام ہوتا ہے تو تشبیہات واستعارات کا ایک مینہ برستا ہے جو اہلِ دل کے سامنے کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است کا منظر پیش کرتا ہے۔ غالب خود کہتے ہیں۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارِ بخونِ دل ؎

قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

واقفِ رموزِ زبان و بیاں برادرِ گرامی پروفیسر کلیم احسان بٹ صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ ایک طویل عرصے سے گجرات کے مردم خیز خطہ میں عروسِ علم وادب کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ ان کے ہزاروں تلامذہ اس چشمۂ صافی سے فیض یاب ہو کر ملک کے گوشے گوشے میں قندیلِ آگہی کو فروزاں کرنے میں مصروف ہیں۔ اپنے تلامذہ میں ذوقِ سلیم پیدا کر دینا اُن کا طرہ امتیاز ہے۔ اردو ادب کا اُستاد بھی ہو اور ساتھ شاعر بھی ہو تو تعلیم و تعلم کا ذوق دو آتشہ بل کہ سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ جناب کلیم احسان بٹ صاحب کے اشہبِ قلم کی جولانیاں ''گجرات میں اردو شاعری'' سے شروع ہوئیں اور پھر وہ بتدریج بحرِ ارتقا میں غوطہ زن رہیں۔ پھر وہ ''موسمِ گل حیران کھڑا ہے'' کی جانب ملتفت ہوئیں۔ موسمِ گُل کی نکہت افشانیوں سے مشامِ جاں کو معطر کرنے کے بعد ''ابرِ رحمت'' کی طلبگار ہوئیں اور اس سلسلے میں دو جلدیں مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد متلاشیانِ تابشِ جمال کے لیے ''چلو جگنو پکڑتے ہیں'' صفحۂ دہر پر جلوہ گر ہوئی۔ بعد ازاں جناب کلیم ادب کا ذوقِ تحقیق وجستجو تھما نہیں رُکا نہیں اور اُس نے تسخیر کے نئے اُفق تلاش کرنے شروع کر دیے تا کہ آنکہ ''تفہیم وتحسین'' مرتب کر ڈالی۔ اہل نظر کو وادیٔ استعجاب میں لے جانے کے لیے ''حیرت باقی رہ جاتی ہے'' تخلیق ہوئی پھر پروفیسر کلیم صاحب کی کلکِ صدف بار نے ایک اور مرقعٔ حقیقت واستغنا ''ماں بیتی'' جیسا عظیم شاہکار اہل حقیقت کے سامنے روشناس کروایا۔ ''مقالاتِ کلیم'' جناب کلیم احسان کا وہ نتیجہ فکر ہے جو اربابِ دانش کو اپنی طرف کھینچ کھینچ لیتا ہے۔ یہ مصنف کے ذوقِ جمالیات کا وہ مجموعۂ دل کشا ہے جس میں ادبی لطافت پوری رعنائیوں اور زیبائیوں سے محوِ خرام نظر آتی ہے۔ ''پسِ دیوارِ آئینہ'' اور ''کارزیاں'' نے میدانِ ذوقِ آگہی میں نئی جہتیں پیدا کیں، نئے زاویہ ہائے فکر روشناس کروائے اور خرمنِ تدبر کے خوشہ چینوں کو مطلع کرتے ہوئے مضامین نو کے انبار

لگائے۔''غالب سرائی''، اقلیم سخن کے تاجور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے ساتھ بے پایاں اظہارِ محبت کا وہ منفرد انداز ہے۔''غالب شناس'' جس کی ضرورت ایک طویل عرصے سے شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ برصغیر میں شناسایانِ الفاظ و معانی نے اس بدیع الزماں اور نابغۂ روزگار کے حضور جو گل ہائے تحسین و تبریک پیش کیے ہیں انہیں ''غالب سرائی'' کے نام سے مدون کرنا بادی النظر میں کوئی ایسی کاوش نظر نہیں آتی جو ''صاحب کتاب'' کو اہلِ فن میں ممیّز کر سکے۔ یہ نکتہ نظر سطح بین گراں خواب لوگوں کا تو ہوسکتا ہے (جیسا کہ خود جناب کلیم احسان بٹ صاحب کسر نفسی اور عجز و انکسار سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسا رفیع الشان معرکہ انجام نہیں دیا)۔ یہ احساس خود نمائی سے مؤلف کا گریز پا ہونے کا اپنا خیال تو ہوسکتا ہے، مگر میری نظر میں مؤلفِ محترم نے ایک ایسی لازوال خدمت انجام دی ہے جو اہلِ تحقیق و تدقیق کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوگی۔ غالب کی ہستی کوئی سوکھے پھولوں کی طرح نہیں جو مُرجھا جائیں اور وارفتگانِ مظاہرِ فطرت کے مشامِ جاں کو معطر نہ کرسکیں بلکہ یہ ایک لازوال سروِ نونہال ہے جو تادیر فدایانِ فن کے قلوب و اذہان کو جگمگاتا رہے گا اور جب تک آستانۂ غالب پر باذوق لوگ ناصیہ فرسائی کرتے رہیں گے، جناب کلیم احسان بٹ کی غالب سرائی بھی اپنا رنگ جماتی رہے گی۔ اسی باعث میں اسے ایک سرسری یا غیر اہم کاوش قرار نہیں دے سکتا۔ ایسی دل پذیر کتاب کی تدوین وہی کرسکتا ہے جو فکرِ غالب کی گہرائی و گیرائی کو خوب سمجھتا ہو۔ ثقیل وادق تراکیب غالب کی توضیح کرنے کا شعور رکھتا ہو۔ جو غالب کے سوزِ جاودانی شمع کو سمجھتا ہو۔ جو اُس رندِ مۓ خور ند کی مۓ خواری کے لیے روزِ ابر و شبِ ماہتاب کی اہمیت کو سمجھتا ہو۔ جو فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کی سکت رکھتا ہو اور میں دعوی کہتا ہوں کہ مزاجِ غالب سے آشنائی کے یہ خصائص برادرم کلیم احسان صاحب میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ موصوف مکرم ایک ایسی ہی خوب صورت کاوشیں اقبال سرائی کی صورت میں بھی کریں گے تاکہ فدایانِ اقبال بھی بسلسلۂ جستجو اس سے استفادہ کرسکیں۔ آخر میں دعا ہے کہ رب کائنات اس پیکر علم و فن کو تادیر سلامت رکھے تاکہ میدانِ ادب کا یہ بائیکا شہسوار اپنے مفیض کام سے تشنگانِ علم کو فیض یاب کر سکتے ہیں بجا طور پر جناب کلیم سے یہ توقع کرتا ہوں بقول حضرت اقبال (روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ کلیم
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''غالب سرائی: ایک جائزہ''

محمود احمد

آپ جس شاعر یا نثر نگار سے الفت رکھتے ہوں اور اُس کے لکھے ہوئے حرف کے سحر میں مبتلا ہوں تو وہ آپ کے لیے ایک عزیز رشتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چاہتے پھر ہم یہ ہیں کہ اگر اُس کا لکھا ہوا تمام پڑھ بھی لیا ہے تو اُس کے متعلق لکھا ہوا بھی زیر مطالعہ آ جائے۔ اب وہ تحریر جس میں ہمارے دل پسند لکھاری کی مدح ہو تو یوں سمجھیے

ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

والی کیفیت آ جاتی ہے۔ مرزا اسداللہ خاں پر جب کلیم احسان بٹ صاحب نے منظوم خراجِ عقیدت کو ''غالب سرائی'' نامی انتخاب میں ڈھالا تو یہی فرحت ہمیں بھی ہوئی۔

میرے خام علم کے مطابق ابھی تک غالب کے علاوہ اس طرح کا کوئی بھی شاعر نہیں جس کے متعلق کسی صاحب علم نے ماضی اور حال کے نامور اور جید اساتذہ شعراء کے خراج عقیدت کو یوں یکجا کر دیا ہو۔ ان نامور سخن دانوں میں شامل ہیں الطاف حسین حالؔی، قربان علی بیگ سالکؔ اور مہدی مجروحؔ جیسے مرزا نوشہ کے ساتھی اور شاگرد؛ علامہ محمد اقبالؔ عہد ساز نیاز مند غالب، جگر مُرادآبادی، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، سیماب اکبرآبادی، دلاور فگار، علی سردار جعفری، کیفی دہلوی اور بہت سارے اساتذہ جو یہاں سے کوچ کر گئے اور ہمارے اپنے عہد کے گلزارؔ، امجدؔ، عرفان جمیلؔ، ناصر بشیرؔ اور دوسرے بہت سے شعراء۔ ان سب نے اپنے اپنے رنگ سے غالبؔ کو سراہا ہے۔

کہتے تو یہ ہیں کہ غالب زیادہ سراہے جانے کی تمنا نہ رکھتے تھے۔

ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور

ع کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مگر سوال یہ ہے کہ غالب سا عالی دماغ عوام میں وقتی مقبولیت کا خواہشمند ہوگا یا داد اُن سے چاہے گا جو اصلی قدردان ہوں۔ اور یہ بات تو طے ہے کہ مرزا قدردانوں اور بندہ شناسوں سے واقف تو تھے۔ اُن کی نعت کا شعر ہے کہ:

؎ غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دِانِ محمدؐ است

تو غالب سرائی کی خواہش مرزا نے اس طرح بیان کی تھی

؎ وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

اصل تعریف وہی ہے جو انسان کے اپنے کیڈر سے اُس کی ہو یہ تمام شعراء معنوی طور پر غالب کے لیے وحشتؔ اور شیفتہؔ ہی ہیں کہ اُستاد کو شعروں کے پھول بھینٹ کر رہے ہیں۔ الطاف حسین حالیؔ بے شک اس انتخاب میں باقی سب سے بازی لے گئے ہیں۔ مرثیہ میں کیا قادرالکلامی ہے اور کیا استاد کے ساتھ الفت کا اظہار ہے۔

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اس کا مآل کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالب بے مثال کی صورت

اور

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
اُس کے مرنے سے مر گئی دِلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برأت

اس انتخاب میں رنگ بھی خوب یکجا ہوئے ہیں۔ دلاور فگار اس ضمن میں سر بلند ہیں۔ مزاحیہ سے paradoxical انداز میں غالب کے ایک ناقد سے مکالمہ شروع کرتے ہیں اور پھر اُسے socratic method سے گزارتے ہوئے قاری کو غالب کی عظمتِ فکر اور اہمیت سے روشناس کرواتے ہیں۔ شروعات دیکھیئے:

؎ کل ایک ناقدِ غالب نے مجھ سے یہ پوچھا — کہ قدرِ غالب مرحوم کا سبب کیا ہے؟
مجھے بتاؤ کہ دیوانِ حضرتِ غالب — کلام پاک ہے، انجیل ہے کہ گیتا ہے؟
؎ کبھی ہے محو حسینوں سے دھول دھپا میں — کبھی کسی کا وہ سوتے میں بوسہ لیتا ہے
جو کہہ رہے ہیں کہ غالبؔ ہے فلسفی شاعر — مجھے بتائیں کہ بوسے میں کیا فلسفہ ہے؟

سے وہ مکالمہ شروع کرتے ہوئے غالبؔ کی بین الاقوامی شہرت و عظمت کے اعتراف، اُن کی قصیدہ نگاری اور شراب نوشی پر چوٹیں

کرتے ہوئے کہلواتے ہیں

؎ سنا ہے کہ وہ صوفی بھی تھا ولی بھی تھا اب اس کے بعد تو پیغمبری کا درجہ ہے

یہاں سے climax کے بعد فنکار اپنا مدعا بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور جس طرح غالب کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ مدح سرائی میں حد سے گزر جانے والوں کو کہتے ہیں۔

؎ جو چاہتے ہیں کہ فوق البشر بنا دیں اُسے
ہمیں تو اُس کے اُن احباب سے بھی شکوہ ہے

اس کا بھی اپنا ہی عمدہ رنگ ہے۔ اور پھر اس کا اختتام نہایت عمدہ شعر سے ہے

؎ اگر یہ سچ ہے کہ الفاظ روح رکھتے ہیں
تو یہ بھی سچ ہے وہ الفاظ کا مسیحا ہے

تو عرض یہ ہے کہ اگر اس پر بات کرتے رہیں تو ہر ہر مصرعہ ہی عمدہ ہے۔ سو اس لطف کے لیے کتاب خود پڑھیے۔

اب جہاں تک صاحبِ کتاب کی بات ہے تو ہم یہ جانتے تھے کہ کلیم صاحب غالب شناس اور غالب کے طرفدار ہیں کہ یوسفی صاحب کی نثر نے کلامِ غالب سے کس طرح خوشہ چینی کی اس بات کے بارے اُن کا عمدہ مفصل مضمون پڑھ چکے۔ مگر اس انتخاب کو جب پڑھا تو ذہن نے اس تحقیقی و علمی کام کے سلسلے میں ہونے والی محنت و مشقت کا جو نقشہ کھینچا اُس کے حوالے سے رومیؔ کا شعر ہے کہ

؎ ہفت شہر عشق درعطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

تو کلیم صاحب غالبؔ کی تخلیق کردہ دنیا کے تمام شہروں کو کھنگال چکے ہیں اور ہم ابھی پہلی گلی کے پہلے موڑ پر کھڑے ہیں۔ شاعری کے علاوہ اس کتاب کے آغاز میں شامل نجا ہی صاحب اور کلیم صاحب کے مضامین بھی غالبؔ پر تحقیقی انداز میں جامع رائے دیتے ہیں۔ بلاشبہ غالبؔ کے قدر دانوں کے لیے یہ ایک تحفہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بادہ خوار ولی اور ''غالب سرائی''

محمد اشفاق ایاز

کلیم احسان بٹ، بنیادی طور پر دانشور شاعر ہے۔اس کے تحقیقی مقالے'' گجرات میں اردو شاعری'' اور پھر پہلے شعری مجموعے'' چلو جگنو پکڑتے ہیں'' سے شروع ہونے والے تخلیقی سفر سے لے کر ان کے حال ہی میں شائع ہونے والے شعری مجموعے'' کارزیاں'' تک میں، دو کلاسیکل شاعروں میر تقی میر اور اسد اللہ خان غالب کے فیض کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ پھر ان دو میں سے کلیم احسان بٹ کی دلچسپی اور فیض کا محور مرزا اسد اللہ غالب ہی رہا۔'' غالب سرائی'' کی ترتیب اور اشاعت سے قبل کلیم احسان بٹ کے غالب پر لکھے گئے تحقیقی مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں سے چند قابل ذکر کا یہاں حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مثلاً:

۱۔غالب اور موسیقی

۲۔غالب کا تصور عشق

۳۔غالب کی نثر میں انگریزی الفاظ

۴۔غالب کی تعلیم

۵۔کلام غالب کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کی ضرورت

وغیرہ غالب کی شخصیت اور اس کے فن میں دلچسپی رکھنے والوں سے داد وصول کر چکے ہیں۔

303 صفحات کی اس کتاب کے پیش لفظ میں کلیم احسان بٹ نے لکھا ہے:

'' غالب سے دلچسپی کا آغاز دوران تعلیم پروفیسر عبدالواحد کی حلقہ نشینی سے ہوا۔۔۔۔ایک زمانہ تھا کہ کلام غالب کو کثرت سے پڑھنا میرا معمول تھا۔ غالب کے متعلق لکھی گئی کتب، غالب کے کلام کی تشریحات، غالب کی زمین میں کہی گئی غزلیں، غالب کے انگریزی، پنجابی تراجم، غالب کی شان میں کہی گئی شاعری، غالب کے خطوط۔۔۔کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس نے مجھے متاثر نہ کیا ہو۔ ایک وقت آ گیا کہ جہاں کہیں کسی تحریر میں غالب کی تراکیب، کوئی مصرع، کوئی شعر، خط کی کوئی سطر دیکھتا تو فوراً پہچان لیتا کہ غالب کی خوشہ چینی کی گئی ہے''

عصری اردو ادب میں تحقیق و تنقید کے حوالے سے معتبر ترین نام جناب محمد اکرم کنجاہی کا ہے۔انہوں نے''غالب سرائی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے طویل مضمون میں کلیم احسان بٹ کی کاوش کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کلیم احسان بٹ کثیر الجہات اور کثیر الاشاعت شاعر و ادیب ہیں۔غالب ان کے ممدوح ہیں۔انہوں نے مرزا کی محبت میں کتب خانوں، ادبی جرائد، اخبارات کے ادبی صفحات، اور صاحب علم دوستوں سے رابطے کے بعد ایسی منظوم تخلیقات الف بائی ترتیب سے یکجا کر دی ہیں جن میں اردو غزل کے عظیم ترین شاعر کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔۔۔۔کلیم احسان بٹ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ غالب یعنی غالب الشعراء کو کلماتِ تحسین پیش کرنے کے لیئے ایک عمدہ کتاب ادب کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔''

کلیم احسان بٹ کی تحقیق و جستجو کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے 1947ء سے لے کر عصر حاضر تک کے کتب و رسائل کو چھان مارا۔پھر کہیں 73 نامور شعرائے کرام کا انتخاب کر کے ان کا کلام کتاب میں شامل کیا۔چونکہ غالب کا جائے مولد اور جائے مدفن انڈیا میں ہے۔اس لیئے وہاں کے کلاسیکل اور جدید شعراء کو ان سے جو عقیدت اور انسیت ہے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے شعراء کی بڑی تعداد کا کلام شامل کیا گیا ہے۔خاص طور پر وہ کلام جو 1960ء کی دہائی میں مشاعروں میں سنایا گیا یا رسائل و جرائد میں شائع ہوا۔غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی اس وقت ابراہیم ذوق سمیت سیکڑوں شاعر تھے،لیکن جو شہرت دوامی بادہ خوار ولی مرزا غالب کے حصے میں آئی وہ کسی درباری شاعر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔غالب کی شاعری اور اس کے شعری رموز کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے اس کے منفرد انداز بیان کو اہل قلم، شاعر اور نثر نگار انہی رموز کی تفہیم کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

کلیم احسان بٹ کی مرتب کردہ تحقیق و تخلیق''غالب سرائی''میں غالب کی مدح میں طویل نظمیں بھی شامل ہیں اور چھوٹی نظمیں بھی۔بلکہ تین سطری''ماہیا''قسم کی نظم بھی شامل ہے۔جنہیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ غالب کو ہر رنگ اور ہر ذوق کے شاعر نے ہدیہء تبریک پیش کرنا اپنے لیے سعادت سمجھا۔''غالب سرائی''مرزا غالب کی شخصیت، اس کی بشری خوبیوں خامیوں، اس کے فن اور اس کے عہد کو سمجھنے کے لیے بہترین انتخاب ہے۔جو نثری مضامین کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر اور جاندار ہے۔کیونکہ نثر نگار جو ایک بات کئی صفحوں میں بیان کرتا ہے، شاعر وہی نقشہ اپنے دو مصرعوں میں کہیں زیادہ جامع اور مؤثر انداز سے بیان کر دیتا ہے۔ ان کے مطالعے سے غالب کا دور پورے پس منظر کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک عورت کے دُکھ اور ارمانوں کو ایک عورت ہی بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔اسی طرح ایک صاحب بصیرت اور عمدہ شاعر ہی کسی دوسرے شاعر کے خارجی و داخلی دُکھ اور شعری رموز کی بہتر انداز میں تشریح کر سکتا

ہے۔کلیم احسان بٹ کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی ہے کہ اس نے غالب کے کلام کی تفہیم میں اپنی شعری صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کیا کہ غالب کے کلام کے سارے اسرار و رموز اس کے سامنے کھُلتے چلے گئے۔

313 صفحات کی اس کتاب میں ہندوستان اور پاکستان کے کم و بیش 73 نامور و معتبر شعراء کی 86 نظمیں، غزلیں، مرثیے، قصیدے شامل کیے گئے ہیں۔جن میں علامہ محمد اقبال، الطاف حسین حالی، احسان دانش، احمد علی برقی اعظمی، امجد اسلام امجد، جگن ناتھ آزاد، جگر مراد آبادی، حفیظ تائب، ساحر لدھیانوی، سیماب اکبرآبادی، گلزار، محسن احسان، سید محمد جعفری، میر مہدی مجروح قربان علی بیگ سالک، محسن احسان، وغیرہ صف اول کے شعرا قابل ذکر ہیں۔ ہر شعری تخلیق کے آخر میں اس کا ماخذ بھی دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں ان کتب اور رسائل کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے جن سے صاحب کتاب نے اپنا مواد اخذ کیا ہے۔

اگر اردو کے کلاسیکل شاعروں کے کلام کی طرف نظر دوڑائی جائے تو غالب کے حریف ابراہیم ذوق کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو غالب کی شعر گوئی کا معترف نہ رہا ہو۔ان کلاسیکل شعرأ میں الطاف حسین حالؔی کا نام سب سے اوپر آتا ہے۔حالؔی اصل میں غالب کے حلقۂ فکر کا شاعر تھا۔اور اسے غالب سے کئی لحاظ سے خاص قربت، انس اور عقیدت تھی۔کلیم احسان بٹ نے ''غالب سرائی'' میں الطاف حسین حالؔی کے''ترکیب بند مرثیہ جناب اسداللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص غالب'' شامل کر کے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔اس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے:

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

برصغیر کے شہرۂ آفاق شاعر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال بھی غالب کے مدح سراؤں میں شامل ہیں۔اقبالؔ نے اپنی نظم ''مرزا غالب'' میں غالب کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تُو، بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

نشتر امروہوی نے اپنی طویل نظم ''غالب کا پوسٹ مارٹم'' میں غالب کے ایک شعر کی خوبصورت ترجمانی کرتے ہوئے انہیں یوں خراج تحسین پیش کیا:

غالب کا شعر ہے:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں ، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

نشتر امروہوی نے کہا:

مرتے مرتے بھی شراب اس کی نہ ہو پائی تھی کم
جام کو تکتا رہا جب تک رہا آنکھوں میں دم

ناصر نظامی نے اپنی تین سطری ماہیا نظم ''مرزا اسداللہ غالب'' میں کہا:

ہر دل تیرا طالب ہے
غالب کا سکہ
تو آج بھی غالب ہے

نازش پرتاب نے اپنی طویل نظم ''غالب'' میں یوں لکھا:

مہمل ہے بات دشنہ و خنجر کہے بغیر
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
چلتا نہیں کوئی تجھے رہبر کہے بغیر
جھکتے ہیں اہل فن ترے در پر کہے بغیر
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہ ہو سکا
ہو کر بھی کوئی تیرے برابر نہ ہو سکا

کتاب میں غالب کی یاد میں دو طویل مرثیوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ ایک میر مہدی مجروح کا طویل مرثیہ ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں:

انتقالِ جناب غالب نے کر دیا خانہء ادب برباد
ہائے جنگل میں اس کی قبر بنی، کاخِ معنی کی جو کہ تھا بنیاد

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جب غالب کا انتقال ہوا اور انہیں جس جگہ دفن کیا گیا وہ علاقہ اس وقت نسبتاً غیر آباد تھا۔ اب تو اس کے چاروں طرف گھنی آبادی ہے۔ اور وہ لوگ جو حالیہ برسوں میں غالب کے مزار پر گئے ہیں ان کے مطابق غالب کے مزار کی حالت بہت خستہ ہے۔ اگر غالب کے مزار سے بے اعتنائی کی یہی صورتحال رہی تو آئندہ چند برسوں میں اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

دوسرا قربان علی بیگ سالک کا مرثیہ ترجیح بند ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں:

کیجئے نالہ اور مر رہیئے
زندگی کی ہے کائنات یہی
کیا کہوں کون مر گیا سالک
آپ کہتے ہیں طالبؔ و عرفیؔ
رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خان غالبؔ مرد

چونکہ غالب کے اکثر اشعار مزاح کی خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کلیم احسان بٹ نے مزاح نگاروں سید محمد جعفری، ماچس لکھنوی اور دلاور فگار، جو اپنے مخصوص مزاحیہ انداز کی وجہ سے کافی مشہور ہیں، اپنے اس مجموعہ میں ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔ سید محمد جعفری نے اپنی نظم "مرزا غالب فلم سازوں میں" مرزا غالب کے مصرعوں کو خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہوئے غالب کی حس مزاح کو بھڑکانے کی یوں کوشش کی ہے:

فلم سازوں میں چلا آیا ، یہ تھا میرا گناہ
میرا ان ناچنے والوں سے نہیں ہو گا نباہ
کیا زمانہ ہے یہ کیسی سخن آرائی ہے
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

''غالب سرائی'' میں شامل دلاور فگار کی نظم ''غالب کو برا کیوں کہوں؟'' پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ اسے علامہ اقبال کی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ، جواب شکوہ'' کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس نظم کے پہلے حصے میں غالب کو ایک فضول سا شاعر بیان کیا گیا ہے، جبکہ نظم کے دوسرے حصہ میں اس کی نفی کرتے ہوئے غالب کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے فرشتہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

نظم کا پہلا حصہ:

کہاں کے ایسے بڑے آرٹسٹ تھے غالبؔ
یہ چند اہل ادب کا پروپیگنڈا ہے
سنا ہے یہ کہ وہ صوفی بھی تھا ولی بھی تھا
اب اس کے بعد تو پیغمبری کا درجہ ہے

نظم کے دوسرے یعنی توصیفی حصہ میں فرماتے ہیں:

یہ ہم نے مانا کہ کچھ خامیاں بھی تھیں اس میں
یہ کیوں کہوں کہ وہ انسان نہیں فرشتہ ہے
ہزار لوگوں نے چاہا کہ اس کے ساتھ چلیں
مگر وہ پہلے بھی تنہا تھا اب بھی تنہا ہے
کہیں ولی، کہیں واعظ، کہیں خراباتی
سمجھ سکو تو سمجھ لو وہ اک معما ہے

ان کے علاوہ ایک اور مزاحیہ شاعر ماچس لکھنوی کی شاعری سے بھی انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ ماچس لکھنوی نے اپنی طویل نظم ''غالب چچا'' کا ردیف اور قافیہ بھی ''غالب چچا'' ہی رکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

اب ادب کے واسطے خود ساختہ اہل ادب
بن گئے ہیں گردش ایام اے غالب چچا
بعد مرنے کے زباں کی تم نے خدمت کی وہ دوست
جس میں زندے رہ گئے ناکام اے غالب چچا

ماچس لکھنوی نے اپنی دوسری نظم ''غالب سے خطاب'' میں غالب کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

بفیضِ جہل اسے نامور غالب پڑھ کے رکھ دیں گے
جہاں لکھا ہوا دیکھیں گے ظالم نام ور غالب

گوہر ہوشیار پوری، ہندوستان کی اردو شاعری میں بڑا نام ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''قصیدہ در مدح میرزا اسداللہ خان غالبؔ'' میں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

نازشِ حکمت و زبان و بیان
تاجدارِ سخن ورانِ کرام
وہ قلمروئے شعر کا خسرو
اس سے فَر و فروغِ علم کلام

''غالب سرائی'' میں شامل شوق قدوائی کی نظم ''غالب'' کی اہمیت اور قدر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء میں علامہ محمد اقبال کی نظم ''مرزا غالب'' کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ ''غالب'' سے ایک بند بطور تبرک پیش کرتا ہوں:

رونق بزم علم و فن، ہے تو تری رقم سے ہے
تختہ ءگُل زمینِ شعر، ہے تو ترے قلم سے ہے
دامنِ بحر پر گُہر، تیرے یم کرم سے ہے
پیکر معنوی میں جاں، تیری زباں کے دم سے ہے

اس کتاب کے مطالعے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ کلیم احسان بٹ نے اپنے اس تحقیقی اور صبر آزما کام کو بڑی خاموشی، محتاط روی اور لگن کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ یہ اس کی غالب کے ساتھ عشق کی بڑی مثال ہے۔ جس کے لیئے بلا شبہ وہ داد کا مستحق ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''غالب سرائی'': ایک نئی تحقیق

سکندر علی

''غالب سرائی''معروف شاعر مرزا غالب کی عقیدت اور تعریف و توصیف میں لکھی گئی منظومات کا مجموعہ ہے؛ جسے پروفیسر کلیم احسان بٹ صاحب نے کمال محنت اور محبت سے مرتب کیا ہے۔ غالب کے فکر و فن پر کلیم صاحب کے متعدد مضامین ملکی و غیر ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں؛ اس علمی و تحقیقی کاوش کا مقصد یہی ہے کہ انیسویں صدی کے اس عظیم شاعر کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

"غالب سرائی" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نامور کلاسیکل شعرا کے علاوہ جدید اور مابعد جدید شعرا کی کل ۶۸ نظموں کو شامل کیا گیا ہے جن میں احمد علی برقی اعظمی کی چار نظمیں، بے صبر سکندر آبادی کی تین نظمیں، تنویر پھول، جگن ناتھ آزاد، سیماب اکبر آبادی، ماچس لکھنوی، محسن احسان اور وقار خلیل کی دو دو نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تلامذہ غالب میں میر مہدی حسین مجروح، قربان علی بیگ سالک اور الطاف حسین حالی کے نام بھی شامل ہیں۔ تمام شعرا کے نام الف بائی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ ہر نظم کے پاورق میں باقاعدہ حوالہ دیا گیا ہے۔ کتاب میں نظموں کا ہیئتی تنوع بھی دیکھنے کو ملتا ہے جن میں بہ لحاظ ہیئت قدیم اصناف سخن میں مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ، رباعی کے علاوہ نظم جدید کی اقسام جیسے آزاد نظم، نظم معری، نثری نظم، سانیٹ وغیرہ کے نمونے شامل ہیں۔

کلیم صاحب کا ایک بڑا حوالہ شاعری تو ہے ہی لیکن غالب سرائی مکمل تحقیقی نوعیت کا کام ہے، یہ کام کلیم صاحب کی تحقیق میں دلچسپی کا غماز بھی ہے۔ تحقیق ایک مشکل، کٹھن اور دشوار کام ہے۔ اس سفر میں ایک محقق کو گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑتا ہے، تحقیق کی وادی میں قدم رکھتے ہی اسے سینکڑوں راستوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے، اسے اصل ماخذات تک رسائی کے لئے خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، ایک محقق سنگ تراش بھی ہوتا ہے جس طرح سنگ تراش پتھر کے غیر ضروری حصوں کو بڑی فن کاری سے الگ کر کے شاہکار تخلیق کرتا ہے بالکل اسی طرح ایک محقق بھی غیر ضروری خام مواد کو رد کرتے ہوئے صرف اسی مواد کو قبول کرتا ہے جس کے بعد ایک تخلیق منصۂ شہود پر آتی ہے۔ کلیم صاحب بھی تحقیق کے اس فن سے بخوبی آگاہ ہیں جس طرح انھوں نے کتاب کے پیش لفظ میں بنیادی و ثانوی ماخذات کا تفصیلاً تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کثیر مواد پیش نظر تھا لیکن یہ ان کے تنقیدی شعور کا کمال ہے کہ جس طرح انھوں نے کثیر مواد میں سے ایک عمدہ انتخاب کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ یقیناً ایسا کام یونیورسٹیوں میں سندی تحقیق کے لئے کیا جاتا ہے۔ کلیم صاحب کی یہ تحقیقی کاوش طلبا اور اساتذہ کے لئے تحقیق کے نئے در وا کرتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی نظم آل احمد سرور کی ہے جس میں انھوں نے شعروادب کو زندہ قوموں کے لئے نعمت قرار دیا ہے اور شعروادب کے توسل سے نہ صرف تہذیب ثروت مند ہوتی ہے بلکہ ادب آنے والی نسلوں کے لئے ماضی کی تہذیب کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح ابراہیم خلیل نے غالب کی مدح میں نظم لکھی ہے اور انھوں نے غالب کی نظم اور نثر کو سراہتے ہوئے غالب کو آسمانِ شعر کا درخشاں آفتاب اور زبانِ شعر کی اقلیم کا واحد تاجدار کہا ہے جس کے اک اک شعر میں اعلی فکر، معنوی تہہ داری، اچھوتا خیال، جدت ادا اور منفرد انداز بیاں جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اس کے بعد احمد علی برقی اعظمی نے ''بیادِ مرزا اسد اللہ خان غالب'' کے عنوان سے نظم لکھی ہے؛ بقول ان کے غالب وہ شاعر ہے جو اپنے عہد میں بھی غالب تھا اور دوسو سال گزر جانے کے بعد بھی غالب، غالب ہے؛ اس نظم میں وہ غالب کو اس کی ادبی خدمات کے عوض نوبل پرائز کا حقدار قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک غالب ایک آفاقی اور عہد ساز شاعر ہے جس کے فن اور فکر سے ہر زمانے کے لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔اسی نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

سب پہ غالب تھے وہ اپنے عہد میں
آج بھی قائم ہے اُن کی آب و تاب
تھا تسلط ان کا نظم و نثر پر
گلشن اُردو میں تھے مثل گلاب
اُردو میں نوبل پرائز کیوں نہیں؟
کب ملے گی اُن کو آخر یہ خطاب؟
شخصیت ہے ان کی برقیؔ عہد ساز
ہو رہے ہیں لوگ جس سے فیض یاب

ناقدینِ فن بیسویں صدی کو اقبال کی صدی کہتے ہیں۔اقبال نے اردو نظم کو نیا لہجہ عطا کیا۔اس نے اسلامی تاریخ کو شعری تجربہ بنا دیا اور فلسفے جیسے خشک موضوع کو بغیر اسلوب کی پیچیدگی کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔اقبال کے ہاں نظم کے داخلی ارتقا کے ساتھ ساتھ شعری روایت بھی پوری آب وتاب سے موجود ہے۔علامہ، مرزا غالب کی شعری عظمت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ انھوں نے مرزا کا اثر بھی قبول کیا۔بانگ درا میں "مرزا غالب" کے عنوان سے نظم؛ علامہ کی غالب سے عقیدت اور محبت کا واضح ثبوت ہے۔ نظم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ غالب کی مدح میں مُبالغے کا گمان ہوتا ہے گو کہ مبالغہ مدح کا حسن اور جان ہوتا ہے لیکن غالب کی شاعری پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ مرزا کی شاعری میں واقعی وہ فنی محاسن موجود ہیں جن کا علامہ نے ذکر کیا ہے۔اقبال، مرزا کے فکروفن، معنی آفرینی بلندی تخیل اور اسلوب بیان کے شیدائی ہیں۔علامہ کی غالب سے عقیدت ملاحظہ فرمایئے:

فکرِ انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو ، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا،محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

اسی طرح الطاف حسین حالی نے غالب کے مرثیے میں مرزا کی بذلہ سنجی،شوخ مزاجی اور اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا ہے۔ غالب کو رشک عرفی اور فخر طالب کہا ہے۔وہ مرزا کو قدسی وصائب واسیر وکلیم سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔مرزا غالب کی یاد میں حالی لکھتے ہیں:

ہند میں نام پائے گا اب کون
سکّہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سَلَف
ان پر ایمان لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اُس کو دل سے بھلائے گا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون

غالب وہ شاعر ہے جسے ہر دور میں نہ صرف پذیرائی ملی بلکہ ہر دور کے شاعر نے اس سے اثر قبول کیا ہے۔ عصر حاضر کے شاعر امجد اسلام امجد نے "غالب خوش نوا" کے عنوان سے غالب کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

غالب خوش نو! مجھ کو رستہ دکھا
راہ پر میں بھی ہوں
دیکھ مڑ کے
ترا ہم سفر میں بھی ہوں

مضمون کے آخر میں کلیم صاحب کے تحقیقی کام اور کتاب کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے چند ہم عصر تبصرہ نگاروں کی آرا کو شامل کرتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین اس کاوش کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں:

"یہ ایک نہایت ہی اچھی کاوش ہے جس کے ذریعے غالب کی عظمت اس دور کے نوجوانوں اور دیگر افراد کے سامنے اجاگر ہوتی ہے۔ ایک طرف سے کتاب ادبی اشخاص کی کاوشوں کی نمائندگی کرتی ہے، تو دوسری طرف تہذیبی اور معاشرتی احیا کی بھی اس میں صورت دکھائی دیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب اردو ادب کے سرمائے میں شمار ہوگی"

اکرم کنجاہی صاحب کے نزدیک

"غالب سرائی" عظیم شاعر کو خراج تحسین کے حوالے سے تازہ کارنامہ ہے۔ جس میں ایسی منظوم تخلیقات الف بائی ترتیب سے یکجا کر دی ہیں جن میں اردو غزل کے عظیم ترین شاعر کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے"

سید روح الامین کے بقول غالب کے حوالے سے اس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ لکھتے ہیں:

"غالب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے قارئین اردو ادب کے اساتذہ اور طلبہ اس کتاب کو نہ صرف اپنے لئے مفید پائیں گے بلکہ یہ کتاب جامعات کے اساتذہ اور طلبہ کے ضروری حوالہ کی کتاب ثابت ہوگی"

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم لکھتی ہیں:

"غالب سرائی" کی صورت میں غالبیات کے طلباء و محققین کے لیے بالخصوص اور ادب عالیہ کا مذاق رکھنے والے قارئین کے لیے بالعموم ایک شان دار کتاب ہے"

آخر میں کتاب کی اشاعت پر پروفیسر کلیم احسان صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کام کو نہ صرف پذیرائی ملے گی بلکہ غالب شناسی کی روایت میں یہ کتاب اپنا منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴿......غالب کی زمین میں غزلیات......﴾

غزل

احمد عطا

رنگ ہائے ستم آمیز دکھاتا ہے مجھے
حشر برپا کیے رکھتا ہے اُٹھاتا ہے مجھے

اشکِ خوں ناب سے ہوتا ہے مہہِ تاب طلوع
قصہَ شامِ الم کون سناتا ہے مجھے

ساعتِ سعد کُجا، ہجر! بُرا ہو تیرا
فرصتِ وصل میں بھی خوب رُلاتا ہے مجھے

یہ سیہ بخت مرا ہے کہ ترا نیک نصیب
روزِ تابندہ میں تارے سے دکھاتا ہے مجھے

صبح ہوتی ہے تو ملتا ہوں میں ریزہ ریزہ
پھر مرا دل شبِ تیرہ میں بناتا ہے مجھے

وعدہ کرتا ہے مکرنے کے لیے روز عطاؔ
محوِ گریہ بھی اگر ہوں تو ہنساتا ہے مجھے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

اشفاق شاہین

صورت ایسی خدا کرے کوئی
ہم سے اکثر ملا کرے کوئی

خود سے لپٹا ہوا ہوں مدت سے
مجھ کو مجھ سے جدا کرے کوئی

سارے سینے کے پار ہوتے ہیں
تیر اک تو خطا کرے کوئی

کیا ضروری ہے کچھ نہ کچھ کرنا
کچھ نہیں ہے تو کیا کرے کوئی

جن کے اشفاقؔ ہم سوالی ہیں
کہہ رہے ہیں بھلا کرے کوئی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل......(نذرِغالب)

ڈاکٹر جنید آزر

وحشتِ جبر ترا لقمۂ تر ہونے تک
سر اُٹھاتا ہوں میں بیگانۂ سر ہونے تک

باندھ آیت کی طرح چوبِ قدیمی سے مجھے
دافعِ رنج و مصیبت ہوں اثر ہونے تک

دشتِ بے حد میں بگولے کی طرح پھرتا ہوں
گرد اُڑتی ہے مری، خاک بہ سر ہونے تک

سرد رہتا ہے جہاں شعلہ، تخلیقِ ہنر
جھلملاتا ہوں وہاں صرفِ نظر ہونے تک

سو کے اُٹھتا ہوں تو دیوار نئی ہوتی ہے
رات کھا جاتی ہے خوابوں کو سحر ہونے تک

غرقِ دریا جو ہوا ہوں تو شکایت کیسی
لہر سے لطف لیا میں نے بھنور ہونے تک

تخمِ اُمید سے یہ عہد کیا تھا میں نے
دُھوپ میں جلتا رہوں گا میں شجر ہونے تک

کیسے ممکن ہے بھلادوں میں غم جاں کا حساب
غم کو رکھتا ہوں میں سینے میں ثمر ہونے تک

میرا کردار کہانی میں ہے اتنا صاحب
بس ترے ساتھ چلوں گردِ سفر ہونے تک

یہ غمِ عشق عجب روگ ہے، دھیرے دھیرے
چاٹ جاتا ہے لہو، عمر بسر ہونے تک

یہ سزا اپنے لیے میں نے چنی ہے آزرؔ
میں زمیں پر رہوں، افلاک میں در ہونے تک

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

(غالب کی زمین میں)

ڈاکٹر خاور بوسالوی

تری زلف کے جب بھی خم دیکھتے ہیں
گھٹاؤں کو بھی چشمِ نم دیکھتے ہیں
مرا دم اٹکتا ہے سینے میں میرے
وہ جب بھی مجھے ایک دم دیکھتے ہیں
کبھی ڈھونڈتے ہیں سکوں اس جہاں میں
کبھی تھک کے سوئے عدم دیکھتے ہیں
بہاریں خزاں بن کے آتی ہیں اکثر
خوشی میں چھپے روز غم دیکھتے ہیں
ہمیں یہ گلہ کہ نہیں دیکھتا وہ
اسے یہ شکایت کہ ہم دیکھتے ہیں
حقیقت میں آنا نہ جانا کسی کا
خیالوں میں نقشِ قدم دیکھتے ہیں
ہمارا کوئی دیکھنا بھی تو دیکھے
نہ دیکھے جسے کوئی ہم دیکھتے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
(غالبؔ)

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

سوچتا ہوں معاملہ کیا ہے
یہ مرے ہاتھ میں شفا کیا ہے

گر محبت نہیں مرے دل میں
قلب میں گلستاں کھلا کیا ہے

کھو گیا ہوں کہاں خدا جانے
پوچھتا ہوں مرا پتہ کیا ہے

جو کرے پیار وہ پریشاں ہو
پیار والوں کو بد دعا کیا ہے

ہو رہے ہیں قلوب میں ماتم
آج کل اور کربلا کیا ہے

بڑھ رہی ہیں جہالتیں ہر سو
علم کا آج فائدہ کیا ہے

گر اندھیرا نہیں کوئی دل میں
آج ہر شخص رو سیاہ کیا ہے

دیپ جلتا رہے لحد پر بھی
ایک انسان کی دعا کیا ہے

ایک خود ساختہ وقار اپنا
اور انسان کی انا کیا ہے

ہے پرانے خیال کا پرتو
سوچ میں آج کل نیا کیا ہے

صبح اور شام میں فقط فاقے
ایک نادار کی غذا کیا ہے

خواہشیں ہو گئیں سبھی پوری
اور تقدیر کی عطا کیا ہے

آج ہے کل نہیں رہے گا یہ
ایک انسان کا پتہ کیا ہے

ہے بقا کی طلب اگر سعدؔی
پھر فنا کے سوا بقا کیا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

شوکت علی

نیت ہی کار فرما گناہ و ثواب میں
زم زم ہوئے حرام ملے گر شراب میں
نیکی بدی و سنگ دلی بندہ پروری
اسرار مخفی آگ، ہوا، خاک، آب میں
ڈوبی ہوئی ہے عشق مہنیوال میں مگر
تاریخ کہہ رہی ہے کہ سوہنی چناب میں
پوچھا مرے رقیب پہ کیوں التفات میں
بس؛ آئینہ نکال تھمایا جواب میں
ممکن ہے بھول جائے زمانہ کبھی مجھے
یہ بھی کہ نام آئے جہانی کتاب میں
اس نے تماس کر کے کہا جانب فلک
دیکھو کہ دیکھ لوں میں تمہیں ماہتاب میں
پھیلی ہوئی ہے چار سو خوشبو وجود میں
دی شب وہ جانے کون تھا آیا جو خواب میں
شوکت تمام عمر میں بہتر فقط وہی
لمحات جو گزارے تمہاری جناب میں

مرزا غالب

(در صنعت توشیخ)

صابر چوہدری بھدوھوی

م۔ مسلک فکر و فن کا وہ تھا امام م معتبر ہے ادب میں اس کا نام م

ر۔ ریختہ میں ہے اس کا اک معیار ر روشنی بار اس کے سب اشعار ر

ز۔ زندہ دارانِ فن میں وہ ممتاز ز زندگانی تھی اس کی سوز و ساز ز

ا۔ آسمان سخن کا تارا تھا ا آشکار اس پہ رمز سارا تھا ا

غ۔ غم سے اس کو کبھی ملا نہ فراغ غ غم سے لبریز زیست کا تھا ایاغ غ

ا۔ اس کے شعروں میں فکر و معنی کا ا آج بھی موجزن ہے اک دریا ا

ل۔ لاکھ کوشش میں ہو جہاں بے حال ل لا نہ پائے گا اس کی کوئی مثال ل

ب۔ بادۂ فکر نو کا تھا طالب ب بالیقیں آج بھی ہے وہ غالبؔ ب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

محمد صدیق ناصح

درد کیا چیز ہے دوا کیا ہے
ایک احساس کے سوا کیا ہے
راہ تکنے لگے ہیں سب تیری
آتے جاتے تُو بانٹتا کیا ہے
کیوں کنکھیوں سے دیکھتا ہے مجھے
منہ سے کچھ بول چاہتا کیا ہے
اس کو دیکھا نہیں گیا مجھ سے
پوچھ مت آنکھ کو ہوا کیا ہے
میں نے حاکم کی بات کاٹی ہے
اس سے بڑھ کر مری خطا کیا ہے
تیری آنکھیں بتا رہی ہیں مجھے
میرے بارے تو سوچتا کیا ہے
مے کدہ اور بادہ پیمائی
میرے ناصح تجھے ہوا کیا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

عرفان جمیل

اک طوفِ بے مدار ہے گرداں کیے ہوئے
اک مرکزہ ہے فکر کو پیچاں کیے ہوئے

کوئی سبب تو ہو کہ ہنسوں اور رو سکوں
اک موجِ بے وفور ہے غلطاں کیے ہوئے

واعظ کے اک بیان پہ رقصاں ہے، پورا شہر
معیار و عارِ وجد کو حیراں کیے ہوئے

اب خرخشے نہیں ہیں فراق اور ہجر کے
گریہ کا ہم ہیں اور ہی ساماں کیے ہوئے

صدقِ تعلقات کو اب لوگ تج چکے
ہم ہیں تکلفات کو میزاں کیے ہوئے

مکروہ لہجہ پھر ہے سماعت کے دورے پر
اُس کی بشارتیں ہیں ہراساں کیے ہوئے

شایاں ہے شہر بھر کو اندھیرا ہی اور ہم
بیٹھے ہیں ایک دیپ فروزاں کیے ہوئے

غزل برمصرعِ غالبؔ

سید فیصل امام رضوی

آفاق نے کتنوں کو سمیٹا مِرے آگے
"ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے"

ہے خشک ہر اک پتّا و غنچہ مِرے آگے
اور شاخِ بریدہ ہے فسردہ مِرے آگے

آنکھوں میں ہے ویرانیِ دنیا مِرے آگے
رونق جسے سمجھے ہو، ہے صحرا مِرے آگے

اُڑتی ہی رہی خاکِ زمانہ مِرے آگے
ہے خوار ہمیشہ سگِ دنیا مِرے آگے

لٹ جاتا ہے عاشق یہاں میدانِ وفا میں
ہوتا ہی نہیں کوئی کرشمہ مِرے آگے

مُٹّھی میں مِری قید ہے دنیاؤں کی دولت
شیریں مِرے پیچھے ہے تو لیلیٰ مِرے آگے

آنکھوں میں مِری پیاس تھی اتنی کہ نہ پوچھو
آب آب ہوا جاتا ہے دریا مِرے آگے

ضد کرتا ہے گڑیا ہی مِرے پہلو نشیں ہو
یہ دل ہے کہ معصوم سا بچّہ مِرے آگے

جب بیٹھ کے کرتا ہوں حسابِ غمِ دنیا
اِک دفترِ دکھ درد ہے کھلتا مِرے آگے

فیصلؔ مجھے نیند آئی تو لوگوں میں مچا غُل
اور شورِ قیامت ہوا برپا مِرے آگے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

کلیم احسان بٹ

مارے پیروں کو ہاتھوں سے خود پکڑ کر کھینچ
گلی گلی میں ہمیں یوں نہ اے ستم گر کھینچ

تو نقش کرنے چلا ہے اگر مری حیرت
کچھاؤ کھینچ کے پھر حُسن کے برابر کھینچ

فصیلِ شہر زمیں بوس ہونے والی ہے
تو منجنیق سے دو چار اور پتھر کھینچ

بڑا سکون ملا تھا زمیں کے بستر پر
اے آسمان مرے سر سے اب نہ چادر کھینچ

جو زہر گھول گیا تھا مری ہواؤں میں
وہ کہہ رہا ہے مجھے سانس اپنے اندر کھینچ

اے شیخ! آ تو مرے ساتھ مل کے زمزم پی
اے برہمن تو مرے ساتھ مل کے ساغر کھینچ

برنگِ شعلہ نہ عجلت میں جل بجھے آتش
چراغِ شوق جلا کر وصالِ دل بر کھینچ

نشاطِ رقص و نے و نغمہ و سخن سنجی
فراقِ یار میں آہیں یہاں نہ اکثر کھینچ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

مستحسن جامی

گرتا تھا کسی یاد کا ملبہ میرے آگے
بچھتا ہی گیا ہجر میں رستہ میرے آگے

وہ جن کو فعولن کے سوا علم نہیں ہے
کرتے ہیں بہت شور شرابہ میرے آگے

میں وحشتِ باطن سے اسے کرتا مسخر
رکھا ہی نہیں قیس نے نقشہ میرے آگے

ہر گام میسر رہے بس عجز کی سیڑھی
کچھ معنی نہیں رکھتا ہے رتبہ میرے آگے

میں سر تا قدم اوڑھ کے رکھتا تجھے جامی
اک بار کبھی تُو جو مہکتا میرے آگے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

(مصرعۂ طرح : صبح دم دروازۂ خاور کھلا: غالبؔ)

نسیمِ سحرؔ

خواب میں کل شب عجب منظر کھلا
مہرباں مجھ پر ہوُا دلبر، کھُلا !
دُھل گئے جتنے گِلے شکوے بھی تھے
وُہ کچھ اس انداز سے مُجھ پر کھلا
پھر کبھی مَیں باہر آیا ہی نہیں!
خواب میں مُجھ پر اِک ایسا در کھلا
حُسن تھا سو زاویوں سے منعکس
آنکھ میں گویا عجائب گھر کھلا!
زہر پی کر زندگی پاتا ہوں میں
آج مجھ پر اپنا یہ جوہر کھلا
رات بھر دستک بہت دی ،تب کہیں
"صبح دم دروازۂ خاور کھلا "
پھر سماعت میں صدا آئی کوئی
پھر کسی دیوار میں اک در کھلا
ہو گئی کتنے زمانوں کو شکست!
جب مِرا پرچم لہو میں تر کھلا
جانے کیا اِس دل کی حالت ہو نسیمؔ!
غم کا دروازہ اگر اندر کھلا

غزل برزمینِ غالبؔ

نسیمِ سحرؔ

شہر بے حِس میں کوئی تو غمگسارِ نغمہ ہے
نوحہ خوانی بھی تو گویا یادگارِ نغمہ ہے
میری کیفیّات سے ہم آہنگ کچھ ایسا ہوا
روح کے اندر بھی رقصاں اضطرارِ نغمہ ہے
وہ جو چاہے، اِک الگ اپنا جہاں تشکیل دے
سُر کے اندر قَید رہنا اِنکسارِ نغمہ ہے
کھُردرے لہجے اثر انداز ہو سکتے نہیں!
چار سُو کھینچا ہوا مَیں نے حِصارِ نغمہ ہے
مُجھ پہ طاری نشۂ مے تو ہَوا بھی ہو چکا
اب ہوں مَیں جس کیف میں، وہ تو خمارِ نغمہ ہے
دل کی بے چَینی نے آخر مسئلہ حل کر دیا
بے قراری میں ہی تو پنہاں قرارِ نغمہ ہے
ساز بے آواز ہیں، نغمہ سَرا چُپ ہو چکے
آج بھی موجود نقشِ پائیدارِ نغمہ ہے
اشکباری پر بھی سرگم کا گماں ہونے لگا
میری چشمِ نم بھی جیسے رُودبارِ نغمہ ہے

دُھن بدل دے سمفنی کی جب بھی اُس کا موڈ ہو
یہ مگر ہر گز کہاں کچھ اختیارِ نغمہ ہے
ہر سُریلے بول کی ہے نغمگی مسحور کُن
شہرِ موسیقی میں اب بھی اقتدارِ نغمہ ہے
کیسے کیسے گلستاں اِس دشت میں آباد تھے!
جا بجا پھیلا ہوا گرد و غبارِ نغمہ ہے
یہ جو ہر دم خون میں ہے بے سکونی اِس قدر
مان لوں کیسے کہ یہ سارا فِشارِ نغمہ ہے
بات مت کیجے بلند آہنگ لہجے میں نسیمؔ
دھیمی سُر میں ہی رواں رہنا وقارِ نغمہ ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴾......غالب کی زمین میں مزاحیہ غزلیات......﴿

غزل

راہی

کالج میں ہوا یہ بھی تماشہ مرے آگے
لڑکی کو جھڑکتا رہا لڑکا مرے آگے

بیوی سے لڑائی کے سبب گھر میں ہمیشہ
منظر ہے وہی ''لوک سبھا'' کا مرے آگے

چلمن سے جھلکتا ہے تبسم ترا لیکن
منہ کھولے پڑا ہے ترا کُتّا مرے آگے

مِسٹر سے مِنسٹر جو ہوا میں، تو یہ دیکھا
ہر شخص ہوا جاتا ہے چمچا مرے آگے

اک ''پی اے'' ہے اور ایک ہے سیکرٹری، یعنی
بھانجا مرے پیچھے ہے، بھتیجا مرے آگے

دو بیویاں ہیں، سالے ہیں، بہنوئی ہیں گھر میں
دن رات ہے ''یو این او'' کا جھگڑا مرے آگے

کمپچر میں تو بیگم مرے پہلو میں ہیں لیکن
سالی مرے پیچھے ہے تو سالا مرے آگے

میں جبکہ ''ایم،ایل،اے'' ہوں تو راس آئے گا کسی کو
امپورٹ اور ایکسپورٹ کا دھندا مرے آگے

اب ''میٹنی'' کا وقت ہوا جاتا ہے، لیکن
رکھتا ہے ریاضی کا یہ پرچا مرے آگے

اسٹیٹ میں اک ''مینا'' بنا رکھی ہے جب سے
چلتا نہیں، ''سی، ایم'' کا بھی بھیجا مرے آگے

بجلی سی گری مجھ پہ نقاب اُٹھتے ہی راہی
یعنی کسی بڑھیا کا تھا چہرہ مرے آگے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

از سرپٹ حیدر آبادی

جوتے بھی کھا کے شاد اگر دل نہیں رہا | عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
دو کوڑی بھی لگاتا نہیں دام اب کوئی | جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لیے ہوئے | میں پوٹلی اُٹھانے کے قابل نہیں رہا
بُھرکس نکالا میرا پتنگوں نے رات بھر | ہوں شمعِ کشتہ در خورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کہ میں | مردار موت مرنے کا قائل نہیں رہا
مدقوق تھا میں پہلے ہی، مفلوج ہو کے اب | شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

برروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے | چہرہ کسی کا دید کے قابل نہیں رہا
مصروف دھنگا مشتی ہیں ساقی سے بادہ نوش | یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقابِ حُسن | مدخول دل خروج پہ مائل نہیں رہا
اعضائے جسم صاف نظر آ رہے ہیں سب | غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار | اس پر بھی غنڈہ گردوں میں شامل نہیں رہا
کی میں نے گرچہ اور بھی لوگوں سے عاشقی | لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں　　دھنگر کوئی بھی کاشت کے قابل نہیں رہا
کفگیروڈوئی تک بھی حسیں لے کے چل دیئے　　حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　پٹ پٹ کےلڑنے بھڑنے کےقابل نہیں رہا
مطلع کا مصرعہ مقطع میں پھر سر پٹؔ آ گیا　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالب اردو شاعروں میں سب سے کشادہ دل ، بلند رو،عمیق شخصیت کے مالک ہیں۔ان میں انسانی کمزوریاں بھی ہیں یعنی رشک وحسد،کمینگی، بزدلی ،غیب وغیرہ کے عناصر بھی ہیں۔اس لیے کہ ان سے پاک ہوکر وہ بھی فرشتہ یا شیطان بن جاتے۔مگران میں جنییس کی ذہانت،ایک مفکر کی بصیرت اورایک بڑےشاعر کی غنائیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

(باقر مہدی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مرزا غالبؔ کی روح سے بصد معذرت

عزیز فیصل

سرکاری جاب میں ہیں وہ موجاں کیے ہوئے
رکھتے ہیں محکمے کو پریشاں کیے ہوئے

گزری ہے ''آں جناب'' کی اب تک تمام عمر
چوبیس گھنٹے خدمت نسواں کئے ہوئے

سرزد ہوئی یہ ہم سے کبیرہ تساہلی
''مدت ہوئی ہے ذکر بشیراں کیے ہوئے''

پھرتی ہیں شادی ہال میں گوری چڑیلنیں
میک اپ سے خود کو اہل پرستاں کئے ہوئے

کیوں گائیکی کے نام پہ خود کو جناب من
رکھا ہے پھیپھڑوں کو بھی ''ہل کاں'' کیے ہوئے

دفتر سے لے کے چار مہینوں کی لانگ لیو (لمبی چھٹی--Long leave)
''بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے''

سب کچھ لٹا کے پندرہ حسینوں کے عشق میں
وہ اپنی مرسڈیز ہیں مہراں کیے ہوئے

مرزا غالب کی زمیں میں کچھ اشعار

عزیز فیصل

وہ اُدھر سے اِدھر نہیں آتی
سیٹ کو چھوڑ کر نہیں آتی

خواب میں جب وہ ملنے آئے تو
لے کے کیوں چارجر نہیں آتی

وہ بھی ہیں ناقدینِ شعر جنہیں
شاعری شعر بھی نہیں آتی

سینئر اہلیہ بھی گھر پر ہے
"پر طبیعت اِدھر نہیں آتی"

کتنے بچے کھڑے ہیں کوچے میں
کیوں نظر اک مدر نہیں آتی

عقد ثانی، نکاح ثالث کی
"کوئی صورت نظر نہیں آتی"

ڈھونڈتے ہیں وہ پن حسینہ کا
جن کو ہتھنی نظر نہیں آتی

گو کہ اردو میں اب وہ ایم فل ہے
اس کو اردو مگر نہیں آتی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
غالبؔ

پیر ظرافت غالبؔ کی نذر

عزیز فیصل

پیٹ کا گھیر ہو جتنا بھی سمال، اچھا ہے
توند ہو حد شرافت میں تو آل(all) اچھا ہے

بیٹھ لیتا ہوں میں کچھ گھنٹے وہاں روزانہ
کوئے جاناں میں وہ چائے کا سٹال اچھا ہے

اس حسینہ کی غزل سن کے کہا بوڑھوں نے
شاعری دیکھنے والی ہے، یہ مال اچھا ہے

پیشگی جس کو لفافے سے ہی طے کر لیا جائے
ہر صحافی کا وہی ایک سوال اچھا ہے

لفظ آنٹی پہ بھی غصے میں نہیں آئے تو
''مجھے لگتا ہے کہ مادام کا حال اچھا ہے''

میں تو کرتا ہوں مکمل ہی ڈرامے بازی
لوگ کہتے ہیں مرا طرز ملال اچھا ہے

اہلیہ مجھ سے کسی روز تو ڈرنے لگے گی
''دل کے بہلانے کو فیصل یہ خیال اچھا ہے''

غزل

ڈاکٹر عمران ظفر

کسی ممتحن سے رشتہ اگر استوار ہوتا
تو نہ فیل امتحاں میں ، میں یوں بار بار ہوتا
کسی رات کو میسر مجھے وصل یار ہوتا
جو نہیں تھا روز ممکن چلو ہفتہ وار ہوتا
ترے دل پہ روز کرتا اے صنم ڈرون حملے
ترا دل کہاں پڑا ہے پتا ایک بار ہوتا
میرے گھر میں پانچ سالے، یوں نہ رہتے ڈیرہ ڈالے
اگر ان کا شہر بھر میں کہیں کاروبار ہوتا
کہیں نیب میں ہمارے بھی جو ہوتے چاچے مامے
انہی رشتہ داریوں کا ہمیں بھی خمار ہوتا
جو میری بجائے ان کا کبھی مجھ پہ دل جو آتا
تو وہاں بھی، جو یہاں ہے، وہی انتظار ہوتا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

ڈاکٹر عمران ظفر

ہائے بیگم تجھے ہوا کیا ہے!
یعنی غصہ یہ ناروا کیا ہے
پہلے مرتی تھی ، آج مارتی ہو
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے
خالی صندوق پیٹیاں کولر
مرے سسرال نے دیا کیا ہے
اب گزارا ہوا بڑا مشکل
صرف تنخواہ میں رہا کیا ہے
کام کروانا ہے تو دے رشوت
"میں نہیں جانتا دعا کیا ہے"
تُو تو سب جانتا ہے یار ظفرؔ
راز تجھ سے کوئی چھپا کیا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غزل

ڈاکٹرعمران ظفر

درد سے میرے ہے بے قراری ، ہائے ہائے
''پہلے تونے کس لیے سینڈل تھی ماری ، ہائے ہائے''
جیب تھی ہلکی تو دل میں شوق کیوں پالا تھا یہ
روزہ افطاری پڑی ہے اب کے بھاری ، ہائے ہائے
دل ، جگر ، گردہ ، کلیجہ کب کے یارو جل گئے
اس نے جو ڈالیں نگاہیں تابکاری ، ہائے ہائے
مغربی دنیا سے فطرت بھی ہے اتنی سرد مہر
روز ہوتی ہے وہاں پہ ژالہ باری، ہائے ہائے
دیکھ تُو ہوش و خرد سے کام لے ورنہ کبھی
تجھ کو لے ڈوبے گی امریکہ کی یاری، ہائے ہائے
ہے بنی فوجی کی بیوہ اور اب امداد کو
دفتروں میں کھائے دھکے نت بچاری ، ہائے ہائے
بے گناہ، مظلوم لوگوں سے بھری جیلیں مگر
دندناتے پھرتے ہیں سب اشتہاری ، ہائے ہائے
مدرسے کی مار ، قاری جی کو ، میں بھولا نہیں
اک ذرا غلطی پہ لگتی ضرب کاری ، ہائے ہائے
بجلی نہ ہونے سے ہر اک مل مقفّل ہو گئی
روز بڑھتی جائے ہے بے روز گاری ، ہائے ہائے
اس شعور و آگہی کے دور میں بھی اے ظفؔر
دیس میں جاری ہے 'رسمِ کاروکاری' ،ہائے ہائے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالبؔ کی رُوح سے معذرت کے ساتھ

کبابؔ علیگ

پیٹ منت کشِ غذا نہ ہوا ''یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا''
کیوں بلاتی ہو اپنے ڈیڈی کو میرا آنا ہوا بلا نہ ہوا
ہے خبر گرم گیہوں آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ راشن کی حکمرانی تھی گیہوں کھا کر مِرا بھلا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں کمینوں کو کیا شریفوں سے فائدا نہ ہوا
کیا کسی خان کی حکومت تھی قرض لے کر مرا بھلا نہ ہوا
دھونس دیتے ہو، کوتوالی کی دل ہوا میرا چوٹّا نہ ہوا
سینکڑوں جمع ہیں پولیس والے کوئی نہ بلوا ہوا، گلا نہ ہوا
شیخ صاحب سے اپنی بیوی کا ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''
لادے جاتے ہو لادیاں غم کی کوئی عاشق ہوا گدھا نہ ہوا
کتنے شو ہوتے ہیں خدا قسم گھر ہوا اُن کا سنیما نہ ہوا
بچ گئی جان، خیریت گزری اُن کے ڈیڈی کا ملنا نہ ہوا

کیسے تم نے کھلائے آج کباب
ذائقہ منہ کا چٹ پٹا نہ ہوا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴾......قطعات......﴿

انور مسعود

عِزّت مند

لارنس پُور سے بھی وہ پُورا نہ ہو سکا
حد سے بڑھا ہوا مرا شوقِ نمود تھا
عزّت مجھے ملی ہے تو لنڈے کے سُوٹ سے
''میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا''

ہوئے تم دوست

اِس طرح کر رہا ہے حقِ دوستی ادا
اُس کا خلوص ہے مجھے حیراں کیے ہوئے
مُدّت سے ہے اناج کا دُشمن بنا ہوا
''مُدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے''

درپیش

اک ہے درپیش ہم کو مسئلہ کشمیر کا
اور دُوجا مسئلہ ہے ڈیم کی تعمیر کا
اِس پریشانی میں اپنی رات کٹتی ہی نہیں
''صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا''

کچھ کہاں سب

اِک غبارستاں برپا کر گئیں ہیں موٹریں
گرد کی موجیں اُٹھیں اور ایک طوفاں ہو گئیں
راہرو جتنے تھے سب آنکھوں سے اُوجھل ہو گئے
''خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: بشمیر (سال چہارم)

چودہ طبق روشن

ایک دفعہ مرزا صاحب کے ایک شاگرد نے مرزا سے کہا کہ ''حضرت آج میں امیر خسرہ کی قبر پر گیا تھا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھِرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کُھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا ہوں۔''

مرزا صاحب نے کہا ''ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیلپیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔''

﴾......قطعات......﴿

ڈاکٹر عمران ظفر

دورانِ تفتیش

ہم نہیں کوئی ڈاکو ، جرم سے ناواقف ہیں
اس نے کب سنی اپنی، ہم نے لاکھ سمجھایا
روئے دھوئے ہم، لیکن، اہل تھانہ کے آگے
''آہ بے اثر دیکھی نالہ نا رسا پایا''

ہومیو پیتھک

ہومیو پیتھک علاج کے صدقے
گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
چھے مہینے علاج کر کے بھی
''میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا''

سگِ جاناں

ترے کوچے میں آ کے کس قدر پچھتا رہا ہوں میں
نتیجہ کیا نکلتا ہے ، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سگ جاناں بڑے غُرا کے دوڑے ہیں مری جانب
''نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے''

الرجی کا مریض

سحر تا شام میں اپنے بدن کو ہی کھجاتا ہوں
سرِمحفل مری چھینکیں نہیں رکھتی بھرم میرا
گلے میں ہار ڈالو تو ، مری حالت بگڑتی ہے
''کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا''

جوازگدائی

میں نے بھکاری کو جو ظفرؔ ڈانٹ کر کہا
غیرت اگر نہیں ہے تو مانگا کرے کوئی
بازو اُٹھا کے مصرعۂ غالبؔ سنا گیا
''جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی''

سیاست گزیدہ

اب اہلِ سیاست سے تو دل بھر گیا اپنا
ہر روز ہی دیتے ہیں یہ بس ایک بیاں اور
اب ان کے دکھاووں سے ظفرؔ ایسے ڈرے ہیں
''کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور''

تضمینِ غالبؔ بر غزل بہادر شاہ ظفر

مرزا غالبؔ نے بادشاہ کی اس غزل کو تضمین کیا تھا۔ روبرو پیش ہو کر تخت کے آگے آ کر سنائی۔

دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو، ظفرؔ
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی
تو نے دیکھا؟ مجھ پہ کیسی بن گئی، اے راز دار
خواب و بیداری پہ، کب ہے، آدمی کو اختیار؟
مثلِ زخم، آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا ہوشیار
کھینچتا تھا، رات کو میں خواب میں، تصویرِ یار
جاگ اُٹھا، جو کھینچتی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں، اے دلنواز
مستیِ چشمِ سیہ سے، چل کے، ھوویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا، تھا جو محوِ خوابِ ناز
دیکھتے ہی، اے ستمگر، تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر، آدھی رہ گئی

اس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات؟
جس کے حسنِ روزافزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ، گزری ہوں گی راتیں پان سات
اس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یکٔ ہفتہ کی رات
تابشِ خُرشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں، فراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں
جُز غم و رنج و الم، گھاٹا ہے ہر یکٔ بات میں
کم نصیبی اِس کو کہتے ہیں کہ میرے ھات میں
آتے ہی، خاصیتِ اِکیسر آدھی رہ گئی

سب سے، یہ گوشہ، کنارے ہے، گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے؟ گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اتارے ہے، گلے لگ جا مرے
مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے؟ گلے لگ جا مرے
وصل کی شب، اے بُتِ بے پیر، آدھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے؟
پر نصیب اپنا، اُنہیں جاتا سنا جوں، پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
آ کے آدھی دُور، میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے؟
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو، یارب، کب کی بات؟
کچھ نہیں کہتا کسی سے، سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں، ہاں، وہ پرسوں شب کی بات؟
نامہ بر، جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب
ہاں، چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب!
پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصفِ شب
نکلی آدھی حسرتِ تقریر، آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو: دیکھ، اے غالبِ آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے؟ گیا کیوں، اس کے گھر؟
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر
واں کے جانے میں، مری توقیر آدھی رہ گئی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴾......تضمین غالبؔ......﴿

صبا اکبر آبادی

غزل

شکر ہے مجھ کو فائدہ نہ ہوا چارہ گر باعث شفا نہ ہوا
خوش ہوں احسان غیر کا نہ ہوا ''درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا''

میرے غم سے نہ غیر واقف ہو خود ہی اس بات کو ذرا سوچو
مجھ کو بد نام دو جہاں نہ کرو ''جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا''

اب کسے حالِ دل سنانے جائیں کس کے قدموں پہ سر جھکانے جائیں
تیغ کس کی گلے لگانے جائیں ''ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا''

جتنے دشنام جانتے ہیں ادیب کوئی باقی نہیں قریب قریب
پھر بھی ہنستا رہا وہ ہائے نصیب ''کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا''

ہائے اے گرد شوزمانے کی ہے جگہ کون سی بٹھانے کی
شکل دیکھوں غریب خانے کی ''ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا''

تیری چوکھٹ پہ جبہ سائی تھی اپنی دنیا وہیں بنائی تھی
تجھ سے اُمید دل ربائی تھی ''کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا''

حسن نے اس کی زندگی بخشی عشق پر اس کے جان صدقے کی
مر گئے ہم تو کوئی بات ہوئی ''جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

مرزا غالبؔ

اقبالؔ

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مُرغِ تخیل کی رَسائی تا کجا
تھا سراپا رُوح تُو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بَربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مُضمَر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جُنبِش ہے لبِ تصویر میں

نُطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثُریّا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تَصَدُّق ہے ترے انداز پر
خندہ زَن ہے غنچۂ دِلی گل شیراز پر

آہ تُو اُجڑی ہوئی دِلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہم سَری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں؟
آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اُردُو ابھی مِنّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دِل سوزیٔ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر!
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گُہر

دَفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا
غالبؔ

غالبؔ کو بُرا کیوں کہوں

دلاور نگارؔ

کل ایک ناقدِ غالبؔ نے مجھ سے یہ پوچھا
کہ قدرِ غالبِؔ مرحوم کا سبب کیا ہے؟

مجھے بتاؤ کہ دیوانِ حضرتِ غالبؔ
کلامِ پاک ہے انجیل ہے کہ گیتا ہے؟

سنا ہے شہر کراچی میں ایک صاحب ہیں
کلام ان کا بھی غالبؔ سے ملتا جلتا ہے

ہمارا دوست طفیلی بھی ہے بڑا شاعر
اگرچہ ایک بڑے آدمی کا چمچہ ہے

تو پھر یہ غالبِؔ مرحوم ہی کی برسی کیوں
مجھے بتاؤ کہ ان میں خصوصیت کیا ہے؟

نہ ذوقؔ کا ہے کہیں تذکرہ نہ مومنؔ کا
نہ ذکرِ میرؔ کہیں ہے نہ یومِ سوداؔ ہے

یہ فیضؔ و ماہرؔ و جوشؔ و فراقؔ کچھ بھی نہیں
مری نظر میں تو غالبؔ سے ذوقؔ اونچا ہے

مجھے تو میر تقی میرؔ سے ہے ایک لگاؤ
کہ میر کچھ بھی سہی شاعری تو کرتا ہے

یہ رنگ لائی ہے غالبؔ کی پارٹی بندی
کہ آج سارے جہاں میں اسی کا چرچا ہے

یہ روس والے جو غالبؔ پہ جان دیتے ہیں
مرے خیال میں اس میں بھی کوئی گھپلا ہے

کہاں کے ایسے بڑے آرٹسٹ تھے غالبؔ
یہ چند اہل ادب کا پروپیگنڈا ہے

اَنا نے مار دیا ورنہ شاعر اچھا تھا
نتیجہ یہ کہ جو ہونا تھا اس کا آدھا ہے

لکھی ہے ایک غزل کی ردیف ہونے تک
کوئی بتائے کہ کیا یہ بھی سہوِ اِملا ہے

کبھی ہے محو حسینوں سے دھول دھپا میں
کبھی کسی کا وہ سوتے میں بوسہ لیتا ہے

جو کہہ رہے ہیں کہ غالبؔ ہے فلسفی شاعر
مجھے بتائیں کہ بوسہ میں کیا فلسفہ ہے؟

جہاں رقم کی توقع ہوئی قصیدہ کہا
تمہیں کہو کہ معیارِ شاعری کیا ہے؟

شراب جام میں ہے اور جام ہاتھوں میں
مگر یہ رندِ بلا نوش پھر بھی پیاسا ہے

جو شاعری ہو تجمل حسین خان کے لیے
وہ اک طرح کی خوشامد ہے شاعری کیا ہے؟

خطاب و خلعت و دربار کے لیے اس نے
نہ جانے کتنے امیروں پہ جال ڈالا ہے

سنا ہے یہ کہ وہ صوفی بھی تھا وَلی بھی تھا
اب اس کے بعد تو پیغمبری کا درجہ ہے

کہا جو میں نے کہ پڑھیے تو پہلے غالبؔ کو
تو بولے خاک پڑھوں مدعا تو عنقا ہے

مجھے خبر ہے کہ غالبؔ کی زندگی کیا تھی
کہ میں نے حضرت غالبؔ کا فلم دیکھا ہے

سنی جو میں نے یہ تنقید تو سمجھ نہ سکا
کہ اس غریب کو غالبؔ سے دشمنی کیا ہے؟

سمجھ گیا کہ یہ بکواس بے سبب تو نہیں
دماغ کا کوئی پرزہ ضرور ڈھیلا ہے

بڑھی جو بات تو پھر میں نے اس کو سمجھایا
ادب میں حضرت غالبؔ کا مرتبہ کیا ہے

بتایا اس کو کہ ہے زندگی کا وہ شاعر
بہت قریب سے دُنیا کو اس نے دیکھا ہے

عجب تضاد کی حامل ہے اس کی شخصیت
عجیب شخص ہے برباد ہو کے ہنستا ہے

چراغِ صبح کی مانند ہے زندگی اس کی
اک آسرا ہے اک ارماں ہے اک تمنا ہے

جو اس کو روکنا چاہو تو اور تیز بہے
عجیب موجِ رواں ہے عجیب دریا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
رفو کی اس کو ضرورت ہے اور نہ پروا ہے

وہ لکھ رہا ہے حکایاتِ خون چکانِ جنوں
جبھی تو اس کے قلم سے لہو ٹپکتا ہے

بس ایک لفظ کے پردے میں داستاں کہنا
یہ فکر و فن کی بلندی اسی کا حصہ ہے

نہ کیوں ہو آج وہ مشہور پوری دُنیا میں
کہ اس کی فکر کا موضوع پوری دُنیا ہے

پہنچ گیا ہے وہ اس منزلِ تفکر پہ
جہاں دماغ ہی دِل کی طرح دھڑکتا ہے

کبھی تو اس کا کوئی شعر سادہ و رنگیں
رخِ بشر کی طرح کیفیت بدلتا ہے

یہ ہم نے مانا کہ کچھ خامیاں بھی تھیں اس میں
یہ کیوں کہوں کہ وہ انساں نہیں فرشتہ ہے

جو چاہتے ہیں کہ فوق البشر بنا دیں اسے
ہمیں تو اس کے ان احباب سے بھی شکوہ ہے

ہزار لوگوں نے چاہا کہ اس کے ساتھ چلیں
مگر وہ پہلے بھی تنہا تھا اب بھی تنہا ہے

کہیں وَلی ، کہیں واعظ ، کہیں خراباتی
سمجھ سکو تو سمجھ لو وہ اک معما ہے

اگر یہ سچ ہے کہ الفاظ روح رکھتے ہیں
تو یہ بھی سچ ہے وہ الفاظ کا مسیحا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نذرِ غالبؔ

باقیؔ احمد پوری

تری کتاب سے روشن ہے جلوہ گاہِ خیال
ترے بغیر نہ منزل ملے نہ راہِ خیال

یہیں سے ہو کے گزرتے ہیں قافلے سارے
ملی ہوئی ہے ترے دَر سے شاہراہِ خیال

ہر ایک حرف لکھا ہے ثواب کی صورت
کیا نہ تُو نے کسی حال میں گناہِ خیال

ترا کلام سَنَد ہے زمانے بھر کے لیے
نہ کوئی جھول ہے اس میں نہ اشتباہِ خیال

یہیں سے آ کے سبق سیکھنا پڑا سب کو
ترے کلام نے کھولی ہے دَرسگاہِ خیال

ترے شعور کا میدان سَر نہیں ہوتا
شکست مان گئی ہے مری سپاہِ خیال

تجھی سے فیضؔ و فرازؔ و منیرؔ ہیں باقیؔ
تُو بادشاہِ سخن ہے تُو بادشاہِ خیال

اسداللہ خان غالبؔ

ناصر بشیر

غالبؔ یہ ایک بات مری لا کلام ہے
تیرے بغیر ذکرِ سخن ناتمام ہے
ہے تیری شاعری سے اِسے ربط کچھ ضرور
جو بھی قتیلِ بادہ و مینا و جام ہے
جو مجلسِ نجوم کو خورشید میں ملا
تیرا تمام شاعروں میں وہ مقام ہے
تُو نے کہی جو بات وہ ہر شخص کی ہے بات
تیرا کلام آج بھی مقبولِ عام ہے
ہر دَور کے کلام پہ غالب ترا کلام
دیوان مختصر تری شہرت دَوام ہے
شوخی جو تیری ذات سے منسوب ہو گئی
وہ تیری شاعری میں بالاہتمام ہے
تیری سخنوری کی جہاں سے ہے ابتدا
ناصرؔ مرے ہنر کا وہاں اختتام ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴾......تحریف خطوط غالبؔ......﴿

ابنِ انشاء

ہاہاہا۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ غزلوں کا پشتارہ لایا۔ ارے میاں بیٹھو۔ شعر و شاعری کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو مکان کی فکر ہے۔ یہ مکان چار روپے مہینے کا ہر چند کہ ڈھب کا نہ تھا لیکن اچھا تھا۔ شریفوں کا محلّہ ہے۔ پہلے مالک نے بیچ دیا۔ نیا مالک اسے خالی کرانا چاہتا ہے۔ مدد لگادی ہے۔ پاڑ باندھ دی ہے۔ اسی دو گز چوڑے صحن میں رات کو سوتا ہوں۔ پاڑ کیا ہے۔ پھانسی کی ٹکٹر نظر آتی ہے۔ منشی حبیب اللہ ذکا نے ایک کوٹھی کا پتہ دیا تھا جو شہر سے باہر ہے۔ سوار ہوا۔ گیا۔ مکان تو پُر فضا تھا۔ احاطہ بھی۔ چمن اور گل بوٹے بھی۔ لیکن حویلی اور محل سرا الگ الگ نہ تھے۔ ڈیوڑھی بھی نہ تھی۔ بس ایک پھاٹک تھا۔ کمرے اور کوٹھڑیاں خاصی۔ کمروں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں چینی مٹی کے چولہے سے بھی بنے تھے۔ معلوم ہوا بیت الخلا ہیں۔ صاحبان انگریز ان پر چڑھ کر بیٹھے ہیں۔ ایک زنجیر کھینچتے ہی پانی کا تریڑا آتا ہے۔ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ عجیب کارخانہ ہے۔ میں نے کرایہ پوچھا اور جھٹ کہا پانچ روپے منظور۔ ایک روپیہ زائد کی کچھ ایسی بات نہیں۔ لیکن مالک مکان کا کارندہ ہنسا اور بولا۔ پانچ روپے نہیں مرزا صاحب! پانچ سو روپے۔ میں نے کہا۔ خریدنا منظور نہیں۔ کرائے پر لینا ہے۔ وہ مردک سر ہلا کر کہنے لگا۔ پانچ سو کرایہ ہے اور دو سال کا پیشگی چاہیے یعنی بارہ ہزار دو اور آن اُترو۔ یہاں چتلی قبر کے پاس دھنا سیٹھ نے حویلی ڈھا کر اونچا اونچا ایک مکان بنایا ہے۔ دو دو تین تین کمرے کے حصے ہیں۔ کلیان کو بھیجا تھا خبر لایا کہ وہ پگڑی مانگتے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ تمہیں معلوم ہے، میں پگڑی عمامہ کچھ نہیں باندھتا۔ ٹوپی ہے ورنہ ننگے سر۔ لوہارو والوں کے ہاں سے جو پگڑی پارسال ملی تھی، وہ نکلوا کے بھجوادی کہ دیکھ لیں اور اطمینان کر لیں کہ مکان ایک مرد معزز کو مطلوب ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں آیا کہ یہ دستار نہیں چاہیے رقم مانگتے ہیں دس ہزار۔ کرایہ اس کے علاوہ ساٹھ روپے مہینا۔ بڑے بدمعاملہ لوگ ہیں۔ آکر پگڑی پھر صندق میں رکھوادی۔ یہ مالک مکان کل آتا ہے۔ دیکھیے کیا کہتا ہے۔

میرن صاحب آئیں۔ شوق سے آئیں۔ لیکن یہ گانے بجانے والوں میں نوکری کا خیال ہمیں پسند نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ ایک کوٹھی میں مشینیں لگا کر اس کے سامنے لوگ گاتے ناچتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہیں۔ تقریریں کرتے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں ایک ڈبا سامنے رکھ کر سن لیتے ہیں بلکہ اب تو اور ترقی ہوئی ہے۔ ایک نیا ڈبہ انگریز کاریگروں نے نکالا

ہے۔اس میں ایک گھنڈی ہے،اسے مروڑنے پر سننے کے علاوہ ان ارباب نشاط کی شکلیں بھی گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ایک خط ان میں سے ایک جگہ سے میرے پاس بھی آیا تھا۔آدمی تو یہیں کے ہیں۔لیکن انگریزی میں لکھتے ہیں بہت دنوں رکھا رہا۔آخر ایک انگریزی خواں سے پڑھوایا۔مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔کچھ حق الخدمت کا بھی ذکر تھا۔میں تو گیا نہیں۔دوبارہ انہوں نے یاد کیا نہیں۔ چونکہ پیسے دیتے ہیں۔ سرکاروں درباروں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے۔ جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ میرن صاحب مجھے جان سے عزیز لیکن ان لوگوں سے سفارش کیا کہہ کر کروں کہ سیدزادہ ہے؟ اُردو فارسی کا ذوق رکھتا ہے؟ اسے نوکر رکھو۔اچھا رکھ بھی لیا تو کاپی نویسوں میں رکھیں گے۔میر مہدی یہ وہ زمانہ نہیں۔اب تو انگریز کی پوچھ ہے یا پھر سفارش چاہیے۔

خط لکھا لیا اب محل سرا میں جاؤں گا۔ایک روٹی شوربے کے ساتھ کھاؤں گا۔شہر کا عجب حال ہے۔باہر نکلنا محال ہے۔ ابھی ہرکارہ آیا تھا۔خبر لایا کہ ہڑتال ہو رہی ہے۔ہاٹ بازار سب بند۔لڑکے جلوس نکال رہے ہیں۔نعرے لگا رہے ہیں۔کبھی کبھی لڑکوں اور برقندازوں میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔میر مہدی معلوم نہیں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔میرن کو وہیں روک لو۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیرالدین کو دعا۔

نجات کا طالب
غالبؔ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محمد کاظم کے نام

محمد خالد اختر

اومیاں سیدزادے! مان ہائیم، قفقاز جرمنی کے رہنے والے!

دوپہر کوڈاک کا ہرکارہ آیا۔تمہارا گنگا جمنی لفافہ میں ملفوف خط ولایت سے لایا۔ بادل پژمردگی اور رنجوری کے چھٹے۔صاحب جی اُٹھا، دل نے کہا، خضرِ آشفتہ نوا! اُٹھ ہرکارے کی بلائیں لے لے۔لفافے سے نظر اُٹھاتا ہوں تو وہ غائب! خط کھولا تو اس میں تمہارے حال کے مسکن کے گلی کوچوں کے تصویری کارڈ اور تمہاری کلاس کے رنگین فوٹو نکلے۔بھئی تم نے میرا کہا یاد رکھا۔صادق القول آدمی ہو۔شبیہ مبارک نظر افروز ہوئی۔بے ریش و بروت۔مغل بچے لگتے ہو۔بتانِ افرنگ تم پر مرتی ہوں گی۔ داڑھی منڈوا کر بڑی مردی و مردانگی تم نے دکھائی۔میں نہ کہتا تھا کہ میرا یار کاظم داڑھی مونچھ پر استرا پھرائے تو حسینانِ جہاں کو شرمائے۔تم پر رشک البتہ مجھ کو یوں نہ آیا کہ جب میں مکتب میں پڑھتا تھا اور سولہ سترہ برس کے سن میں تھا تو میرا رنگ کھلتا بنفشی تھا، بال گھنے گھنگریالے تھے اور قدر دان لوگ دیدہ و دل کو فرش راہ کرتے تھے۔بازار میں بن ٹھن کر نکلتا تو کوٹھوں سے نازنینانِ پردہ نشین اُٹھ اُٹھ کر جھانکتیں اور ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔قدم قدم پر ماحول کے طائفے، کہ میرے نکلنے کے منتظر ہوتے، تحسین وستائش کے جملے کہتے۔اے سیدزادے! اس وقت تم، ہم کو دیکھتے! مجھ سے تمہاری ملاقات جب ہوئی کہ میں وہ پہلے کا سا خضر کب تھا؟ وہ ایک زمانہ تھا میری جان، اب تو تم مجھے زندوں میں نہ جانو، سر آدھا بالوں سے محروم آدھا بگلے کی طرح سپید، گال پچکے ہوئے اور رنگت سیاہ، دائیں اور بائیں جانب کی ڈاڑھیں نکلی ہوئی۔خیر چھوڑو اس ہرزہ سرائی کو!

یہ تم نے کیا لکھا کہ اپنے پڑھے سے تم نے فیض نہ اُٹھایا اور برسوں کی مشق ترجمے اور نثر نگاری نے تمہارے تخیل کو کند کر دیا۔میں نہیں مانتا۔بیجا تملق وخاطر داری کو نہیں کہتا۔تم زبانِ اردو میں اس خوبی اور روانی سے اپنے خیالات ادا کرتے ہو کہ قابل تہنیت ومبارکباد ہو۔تمہارا اسلوب مجھ کو پسند ہے۔تمہاری طرزِ نگارش کا میں شیدائی ہوں۔اس واسطے کہ اس کا ڈھنگ نرالا، اپنی ہی بہار لئے ہے۔سنو! شیکسپیئر اور طالسطائی اور اسداللہ خاں غالب اور سعادت حسن منٹو بننا ہر کسی کا مقدر نہیں۔ان میں شئے لطیف آئی جناب ایزدی سے۔اس کا مطلب یہ کیوں ہوا کہ تم اور ہم فن کی تحصیل میں محنت کش وسخت کوش نہ بنیں۔ان متذکرہ ہستیوں کو سخن طرازی، تمثیل نگاری، داستان نویسی میں ید بیضا حاصل تھا اور ہم اس سے محروم۔یہ سچ ہے۔مگر ہم کو ان متقدمین کے تتبع سے کیوں عار ہو۔بھائی معدودے چند کے ماسوا عوام الناس کو کسب کمال کے لیے مشقتِ خاص اور کاوشِ جگر مقسوم ہے بعض تو جان پر

کھیل گئے اور حاصل کچھ بھی نہیں۔ان کا نام مٹ گیا۔ پر یہ کیوں لازم آیا کہ ان کی زندگی رائیگاں گئی۔وہ جی تو گئے جستجو تو انہوں نے کی حسنِ زیبائے سخن کو پانے کی۔

تم ہپّی (HIPPY) لوگوں میں اُٹھتے بیٹھے ہو یہ خوب کرتے ہو۔ میں ہپیوں کو اچھا سمجھتا ہوں۔ ان نوجوانوں کی بغاوت تمدن وتہذیب جدید کے خلاف۔ رسومِ قدیم وکہنہ کے خلاف۔ خودساختہ ضابطۂ اخلاق کے خلاف۔ مہاجنوں اور ملاؤں اور اہل کلیسا کے خلاف۔ توجیہ ان کی خانہ کوچی۔ گریز پائی۔ بے اطمینانی کی میرے قیاس میں ہے۔ تم ان کو اپنچی، خفقانی اور بدوضع کہو۔ میں گمان کرتا ہوں کہ یہ بھونڈی نئی نسل ایک انقلاب عظیم کی آمد کی علمبردار ہے یہ نسل غرب وشرق، شمال وجنوب کے خطے کے ہر انسان کو ایک رشتے میں پرودے گی۔ دروغ بافی وریا کاری، توہم پرستی و پادشاہی، آدمی میں منافرت پر تعمیر یہ زندان کہ جس میں تم اور میں ہر کوئی رہتا ہے ڈھے جائے گا۔ دیکھو حضرت خضر کی پیش گوئی پوری ہو کے رہے گی۔ انشاءاللہ العظیم۔

اپنے وطن کے حالات سن لو۔ ولایت کے اخباروں میں بھی دیکھتے ہو گے۔ مشرقی پاکستان میں بڑی شدت ہے۔ ایک شخص مجیب الرحمٰن نامی کہ پہلے حکومت کے خلاف ایک سازش میں ملوث تھا۔ دھول، دھونس اور اہل ہنود کے مہاجنوں کی بے دریغ امداد سے انتخاباتِ عام میں جیت گیا۔ حاکمِ اعلیٰ قلمروئے پاکستان نے اس کو انتظام انصرام حکومت سونپنے کا نقشہ مرتب کیا۔ حتیٰ کہ اس کے لیے تاریخ بھی مقرر کر دی۔ وہ شخص تھا مفسد۔ مملکت کو توڑنے کی خاطر اس کو اہل ہند اور چند دوسری سلطنتوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس پر شیر ہوا اور سرکار کے خلاف بغاوت کر دی۔ ڈھاکے میں حاکم اعلیٰ بن بیٹھا اور سب عمال اور اہل کار اس کے اشارے پر چلنے لگے۔ اسکے طائفے کے لوگوں نے خلق خدا پر وہ ظلم ڈھائے کہ الامان الحفیظ۔ باہر کے لوگ جو وہاں بستے تھے۔ ان کے جان ومال، ناموس ومکان تہس نہس ہوئے سرکاری خزانے جس جس شہر میں تھے شورشیوں نے لوٹے، ایک پھوٹی کوڑی نام کو نہ چھوڑی۔ ہزارہا آدمی بشمولیت حکام فون و دیوانی کے ہلاک کر دیئے گئے۔ جس بہیمانہ طریق سے بعض بستیوں میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو ذبح کیا گیا، اس کا حال سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دریں چہ شک کہ آدمی کی جبلت چاہے اس پر ملمع سازی تہذیب واخلاق کی تہ در تہ عمل میں لاؤ۔ خونخوار حیوان کی ہے بلکہ جنگل کے درندے ہم سے کئی لحاظ سے اچھے اور افضل تر۔ مختصر یہ کہ اس قلمرو کے شرقی حصے میں قیامت آگئی۔

جب فتنہ وفساد کا دروازہ بند نہ ہوا تو حاکم اعلیٰ نے واسطے اس سلطنتِ خداداد کو بچانے کے فوج کو حکم مجیب الرحمٰن کی سرکوبی کا دیا۔ باغیوں کا سرغنہ گرفتار ہوا اور اب زنداں میں ہے۔ شنید ہے اس پر مقدمہ بغاوت منجانب سرکار دائر کیا جائے گا جس شخص کے ہاتھ میں مشرقی فوج کی کمینداری ہے۔ تدبیر وہمت اس پر جمع ہیں، اس کا نام ٹکا خاں بتاتے ہیں۔ اس نے صورت حالات کو اب

بڑی حد تک سنبھال لیا ہے مگر باغیوں کے جتھے اور اہل ہنود ابھی تک شرارت پر آمادہ ہیں اور قلمروئے ہند کے عمال وہاں کے اخباروں اور آلہ لاسلکی کے ذریعے بے پر کی افواہیں اُڑانے سے باز نہیں آتے۔ آئمہ اطہار علیم السلام اس سلطنت اسلامیہ کو اپنی امان میں رکھیں۔

سید زادے! اب میری سرگزشت سنو۔ پچھلے چہار شنبہ تمہارے میرے دوست غمگسار اور تمہارے ہم اسم کاظم شاہ لاہور آئے۔ اسمبلی گھر کے قرب میں جو بھٹیار خانہ فلیٹی نام کا ہے۔ اس میں قیام پذیر ہوئے۔ مجھے ان کی آمد کی حتمی اطلاع نہ تھی۔ یعنی ان کے ورود کا علم تو تھا لیکن صحیح تاریخ و روز اپنے آنے کا نہ انہوں نے لکھا نہ میں نے دریافت کیا۔ ہوائی اڈہ پر پہنچتا تو کیوں کر۔ یوں بھی موٹر گاڑی کی ناسازی طبع نے صاحب فراش بنا رکھا ہے۔ ایک پہر دن رہے یومیہ کرایہ کی ٹیکسی گاڑی میں ٹھاٹھ باٹھ سے غم خانے پر تشریف لائے اور باصرار اپنے ہمراہ لے گئے، ریگل کے بائیسکوپ گھر کے پاس ایک پارسی کی شراب کی دکان سے ایک بوتل دیسی جم خانہ وہسکی کی خریدی۔ ماکولات از قسم سوختہ خواج میوہ و کباب ایک اور جگہ سے لئے اور بھٹیار خانے فلیٹی کے نمبر ایک کمرے میں جا کر متمکن ہوئے۔ شیریں گفتاری تو تم اس سید زادے کی جانتے ہو۔ شریک بادہ ناب ہو کر خوب مزے لوٹے۔ نیم شب تک محفل جمی۔ کاظم شاہ نے ان بتانِ افرنگ و معشوقانِ وطن کے ضمن میں داستان سرائی کی کہ جو اس کے تفنگ عاشقی سے قتیل ہوئیں۔ فلاں بانو اور فلاں خانم اور فرالین جو آنا جو برلبِ جو یا بالائے فضائے محیط طیارۂ با درفتار میں ہمارے یارِ طرح دار جمال کے حدت شوق سے بسمل ہوئیں۔ صاحب! ملیح آباد کے شبیر حسن المتخلص جوش کے سترہ اٹھارہ عشق، گوالیار کے سید کاظم شاہ کے اس باب میں کارناموں کے بالمقابل گرد ہیں۔ جناب جوش کو محبوبہ کے وصال کی خاطر جاتے، منڈیر پر پھن پھیلائے سیاہ ناگ کا سامنا ہوا۔ یہاں منزل مراد کی راہ شیروں، بھالوؤں اور حساد طبع بھپرے شوہروں سے اٹی ہوتی ہے دو چیزیں البتہ ان دونوں کشور کشاؤں میں سانجھی ہیں۔ دونوں پر ناز نینانِ کا فرادا پہلی نظر میں مرمٹتی ہیں اور خادماؤں کے سبیل سلسلہ نامہ و پیام کا آغاز کرنے میں دیر نہیں کرتیں۔ صید افگنی کے باب میں کاظم شاہ سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اکیس برس کی عمر تک اکیس شیر شکار کئے۔ اس سے بعد کی تعداد صحیح وہ نہیں جانتے خیر۔ اپنے دوست کے شوقِ زندگی کے الاؤ سے میں نے بھی تمازت پائی۔ چار دن وہ یہاں رہا وہ دن شادمانی اور خورسندی میں گزرے۔ اہل خطا کے طعام خانوں میں بلاخوری کی۔ مال روڈ پر گھومے پھرے۔ کاظم شاہ کے عارضہ قلب اور رات کو شمع حیات گل ہو جانے کے خطرہ سے بہ سبیل ٹیلیفون لاہور کے کل ڈاکٹروں اور اطبا کو مطلع کیا۔ ایک دن پورا گھڑ دوڑ کے میدان میں گزرا۔ میرا وہاں جانے کا پہلا موقع تھا۔ کاظم شاہ نے گھوڑوں پر شرط بدنے کے گُر بتائے۔ اس شہر کے سب خوش فکرے، امیر زادے رنگا رنگ کی پوشاک میں ملبوس وہاں موجود پائے۔ فقیر کو اہل وطن کی زرداری، تمول اور سرخوشی کا احساس ہوا۔

ہم خواہ مخواہ اور بیکار یہاں کی نکبت و مفلسی و نحوست کو روتے ہیں۔ دو پہر دن رہے وہاں سے لوٹے۔ دونوں کی جیبیں خالی۔ میرے چالیس پچاس روپے گھوڑوں کی نذر ہوئے۔ کاظم شاہ نے اپنی متاع تو لٹائی سو لٹائی۔ اپنا دل بھی ایک حسینہ فرخندہ جبیں کو دے آئے۔ وہ گھڑ دوڑ کے حلقے میں ہمیں اپنی ہمجولیوں کے جھرمٹ میں دید میں آئی۔ میاں کاظم کو اس کی ادا بھائی۔ سفید سمور کی ٹوپی اس کافر نے پہنی تھی۔ رنگت بنفشی، ناک نقشہ اہل ولایت کا سا۔ تمہارے دوست نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً وہاں پہنچا۔ اسے نوید دی کہ متوطن بلادِ کراچی ہوں۔ اس کے شہر میں اجنبی۔ اس سے بے تکلفانہ ربط بڑھایا اور یہ بھی کہا کہ جس گھوڑے پر کہو اس پر دام لگاؤں۔ وہ متبسم ہوئی۔ کاظم شاہ نے اس سمور کوٹوپی کی رعایت سے زارینہ (کہ زارِقلمروئے روس کی زوجہ کا لقب ہے)، کا نام دیا۔

کاظم شاہ چلا گیا اور گویا تگ و تازِ زندگی اس کے ساتھ رخصت ہوئی۔ تمہارے بے چارے محمد خالد خاں خضر اب اسی بے ڈھنگی چال سے چلتے ہیں اور زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ تمہارے گئے پیچھے اب ماسوائے ندیم کے کوئی ہم زباں نہ رہا۔

اہل وطن کے اخباروں میں وہی دشنام طرازی، تنفر و کو خوشامد پرستی کے ہنگامے ہیں۔ یہاں سچ بات کہنا جرم۔ کوئی کہے تو کس سے کہے اور سننے والا کون۔ وطن کئی طائفوں میں بٹا ہے کہ باہم دست بگریباں ہیں۔ ایسے ماحول میں حقیقت سے فرار میں عافیت پاتا ہوں۔ ساٹھ ستر جزو کی ایک کتاب چہار مجلد کی ''لارڈ آف دی رنگ'' جو پروفیسر ٹالکین صاحب کی مرقومہ ہے میری بھانجی ناہید بیگم سلمہا اللہ نے مجھے لا کر دی ہے۔ یہ گویا اہل افرنگ کی داستانِ امیر حمزہ ہے۔ دن بھر اس کو دیکھا کرتا ہوں اور دمدار انسانوں، سیمرغوں، پریزادوں، بونوں، بھتنوں اور ساحروں کے عالم حیرت افزا میں کھویا رہتا ہوں۔ پروفیسر ٹالکین کی داستان طرازی سبحان اللہ! بھائی فی زمانہ جب کہ چار سو بہیمیت، شقاوت، عیاری اور فتویٰ سازی کا دور دورہ ہے تو آدمی ایسی داستانوں کی حیرت افزائیوں میں پناہ نہ ڈھونڈے تو کیا کرے۔ سوچتا ہوں کہ حالتِ خفقان میں مَیں مبتلا ہوں یا کہ میرے ہموطن۔ الغرض تمہارا خضر طائرِ نفس ہوا۔

جنابِ خورشید کو کورنش اُن صاحبہ کو مجرا۔ مان گیا۔ میرے وسوسے خام نکلے۔ بھٹی سے کندن بن کر نکلو گے۔ انشاء اللہ العزیز

دید کا طالب خضرؔ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دن شاہی اسپتال میں

انور احمد علوی

علوی صاحب! تم بھی لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو کہ خط میرا تمہارے کسی ہم نام کے ہاتھ جا پڑا۔ بھائی! ایسے فلیٹوں میں کیوں رہتے ہو، جہاں پر دو انور علوی ہوں۔ کئی روز سے خط لکھنے کی فکر میں تھا، پر موقع نہ ملا۔ اچھا اب ناراض نہ ہو اور پوری بات میری سن لو۔ کیا ہوا، پچھلے دنوں آم کھا کر بے دھیانی میں دانتوں کی بجائے اپنی آنکھ میں خلال کر بیٹھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ گھبرا کر باہر کو نکلا۔ بری حالت دیکھی تو مجھے پالکی میں بٹھا، آغا خان اسپتال پہنچا، میں جس کو طبی تجربہ گاہ کہا کرتا ہوں۔ سات بجے شام ایمرجنسی میں لایا گیا تھا، پونے دو بجے شب ڈاکٹر میرے معائنے کو آیا۔ آنکھ سے پانی برابر بہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد فلو کا اثر بتلایا اور خون کا ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ وہ میں نے نہ کروایا کہ اپنے خون پر شک کرنا، ہم ترکوں کی حمیت کے خلاف ہے، اور دوائی لے کر گھر چلا آیا۔ بی بی نے سنا تو دوا اُس نے جھپٹ کی۔ کس واسطے کہ اس کو فلو تھا اور اگلے روز ڈاکٹر سے آنکھوں کی دوا لے کر لوٹی تھی۔ یہ واقعہ جمعرات پندرہ دسمبر کو پیش آیا۔ آج بدھ کا دن اور اکیس دسمبر کی ہے۔ آنکھ سے پانی گرنا ہنوز بند نہ ہوا۔ نہ خط لکھ سکتا ہوں، نہ بنا سکتا ہوں۔ پھر بھی تمہارے دل کی خوشی کے واسطے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ دو حرف لکھتا ہوں وہ بھیجتا ہوں۔ آدھا ہو گیا ہوں، جب کہ والی اودھ آج قضائے الٰہی سے پورے ہوئے۔ کل رات شاہی اسپتال کے مطب برائے افسران اعلا سے معائنہ اپنا کروا کے آئے تھے۔ تمام ٹیسٹ ان کے کلیئر تھے۔

حق مغفرت کرے، عجب، بیمار، مرد تھا!

میری جان، تم بھی کمال کرتے ہو۔ ایک طرف اشیائے صرف کی گرانی کا شکوہ کیا ہے، دوسری جانب معدے کی گرانی کا گلہ کرتے ہو۔ کس بات کو صحیح جانوں۔ الرجی کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ سہو سے کوئی خالص غذا تمہارے استعمال میں آ گئی ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹوں کا کلیئر ہونا، البتہ موجب تشویش ہے۔ میری بات مانو اور ہومیو پیتھک طریقۂ علاج اپناؤ۔ برس دن میں اچھے ہو جاؤ گے۔ قطع نظر اس کے آپ اپنی آنکھ پھوڑ بیٹھا، اب صحت میری تمہاری تحریر کے مانند ہو گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عامل اثر بتلایا ہے۔ حکیم نے جگر پہ ورم بتلایا ہے۔ ڈاکٹر ڈپریشن کا شکار ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے موافق ماں بننے والا ہوں۔ ہومیو پیتھ شوگر کا خدشہ ظاہر کرتا ہے۔ اس نے کئی اشیاء کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔ خاص طور پر زمین کے نیچے اُگنے والی چیزوں کی۔ کہتا

ہے، زمین کے اندر پیدا ہونے والی چیزیں کھاؤ گے، تو تم بھی زمین کے اندر چلے جاؤ گے۔ بھائی! میں جیتے جی کون سا زمین کے اُوپر ہوں، معاشی طور پر پاتال ہی میں ہوں۔ علاوہ اس کے اپنا ای سی جی نکلوایا تھا۔ رپورٹ کے بموجب دل کی حرکات منظّم نہیں۔ صاحب! جو حرکتیں دل کے ہاتھوں سرزد ہوں، وہ کیونکر منظّم ہو سکتی ہیں؟ ہارٹ اسپیشلسٹ نے تین ماہ بعد کی تاریخ دی ہے۔ بہتیرا سمجھایا، بھائی میں تمہاری بچی کی تاریخ نہیں مانگ رہا، بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ سنا ہے تمہارے ہاں کچھ اصحاب میری تخلیقات اور شخصیت پر کام کر کے ڈاکٹر بن رہے ہیں۔ معلوم کر کے بتلاؤ، ان کا شمار کس قسم کے ڈاکٹروں میں ہوتا ہے اور وہ کن امراض کا علاج کر سکتے ہیں۔ سوچتا ہوں، اب اُنہی میں سے کسی کو دکھالوں۔ یہ لوگ میری رگ رگ سے واقف ہوں گے۔

چھوڑو ان باتوں کو۔ لو اَب ایک بات سنو۔ چند روز ہوئے میاں تفتہ کسی کے توسط سے خبر لائے کہ تمہاری ہاں سے نکلنے والا ماہنامہ ''تنگنائے ادب'' میری شاعری پر ایک نمبر نکالنا چاہتا ہے۔ یہ نوید بھی سنائی کہ ایڈیٹر کی نظر میں میری ایک غزل کی قیمت پینتیس ڈالر ٹھہری ہے۔ شبیہ کے پیسے اس سے سوا ہوں گے۔ جھٹ اپنی کئی غزلیں اور قطعے، بمعہ چند تصویروں کے، سپردِ ڈاک کر ڈالے۔ بی بی کو بتلایا تو دیر تلک توصیف میری دانائی اور فہم کی کرتی رہی۔ سوچا، میرے صبر وثبات کی داد ملی۔ جب تلک سرکار سے پنسن کا پڑھا ہوا روپیہ ملے اور اجرا کا حکم آوے، یہ رقم گزارے کو کافی ہے۔ اللہ نے ذلیل ہونے سے کس طرح بچایا۔ بائیس مہینے تلک گھر میں کسی کو بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا، اور اَب اہلِ ادب سے عزت الگ دلوائی۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ناگاہ ایڈیٹر کا خط آیا کہ مرزا صاحب، مذکورہ رقم کا نگارشات کے ہمراہ آنا ضروری ہے۔ ادھار وہ کرتے نہیں۔ قرار داد منظور ہو تو واپسی ڈاک سے مطلع کرو، تا کہ اپنے لے پالک لکھاریوں سے تمہارے فن اور شخصیت پر مضامینِ نو کے انبار لگواؤں، اور خصوصی نمبر کے بعد آنے والے شمارے کے لیے'' قارئین کے خطوط'' لکھواؤں۔ اب سمجھا، معاملے کی نوعیت کچھ اور ہے۔ ناچار ایڈیٹر کو لکھا، بھائی میں عزت دار آدمی ہوں، رقم خرچ کر کے بدنامی مول نہیں لے سکتا! تم کو میرا مشورہ ہے کہ اس سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم اہلِ قلم سے رابطہ کرو۔ بی بی کو اصل صورتِ حال بتلائی تو بڑا سا منہ بناتے ہوئے بولی، ''مرزا! بوڑھا ہونے آیا، داڑھی میں بال سفید آ گئے، مگر بات سمجھنی نہ آئی!''

اب یہاں سے روئے سخن تمہاری متشاعرات کی جانب ہے، جو عروض کی کمی کولے سے پورا کرتی ہیں۔ بھئی، یہ ایک وقت میں دو ریاض اچھے نہیں۔ صرف شاعری کرو، ترنم کی سعی مت کرو۔ تقریبات میں وقت پر پہنچنے کا ریاض تم چاہو تو کر سکتی ہو۔ ہم اپنا کلام خود نہ گاتے تھے۔ لکھ کر ڈومنیوں کو دے دیا کرتے تھے۔ وہ تمہاری طرح نہ تھیں۔ جس کا کلام ہوتا تھا، اسی کے تخلص سے گاتی تھیں، اپنے نام منسوب نہ کرتی تھیں۔ دیکھو! کلام معیاری ہو تو ترنم کے بغیر دل میں اتر جاتا ہے اور آگرہ سے نیا گرا تلک مشہور ہو

جاتا ہے۔

بھائی! یہ آنکھ کی تکلیف کے باعث پڑھنا لکھنا موقوف ہوا تھا، کھانا پینا ترک نہ کیا تھا، جو تم نے آم سندھڑی بھیجنا بند کر دیے۔ زیادہ کیا لکھوں، سب خیریت ہے۔ بس آنکھوں کی تکلیف کے سبب ٹی وی دیکھنا موقوف ہوا۔ کھانے کے بعد شب کو ایک گھنٹا ''بی بی سی'' سنتا ہوں، پھر دو گھنٹے ''بی بی کی!''۔

از غالب: بےنوا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: عامر یوسف (سال دوم)

کالے کی قید

بعد رہائی میاں کالے حضرت محمد نصیر الدین جو بہادر شاہ کے پیر تھے انکے مکان میں آ کر رہے ایک روز میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی مرزا صاحب نے کہا ''کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔''

(اسداللہ خان غالبؔ)

''مجازی مشاعرہ اور جدید غالبؔ''

سہیل احمد صدیقی

غالبؔ بنام میر مہدی مجروحؔ، الطاف حسین حالیؔ، میرزا ہرگوپال تفتہؔ ومیاں داد خان سیاحؔ

جانِ غالبؔ...... جانانِ غالبؔ......کہو اچھے ہو؟

تم لوگوں کے یہاں انٹرنیٹ کی رفتار حسب منشاء ہے یا کچھوے کی مثل؟

خدا معلوم تم لوگوں تک میرا سندیسہ (بطورِ اِمتثالِ اَمر) پہنچا کہ نہیں جو میں نے پچھلے دنوں، فیس بک گروپ ''اردو سرائے'' میں عزیزم سہیل احمد صدیقی سے Post کرایا تھا، عبارت نقل کیے دیتا ہوں: ''میاں! موبائل فون کال اگر نصف ملاقات ہے تو وڈیو کال گویا 'عین ملاقات'۔ سوموار کو میر مہدی مجروح سے وڈیو کال پر بات ہوئی، گویا عین ملاقات ہوئی......رہے حالیؔ وتفتہؔ تو اُن کے یہاں Signals کا مسئلہ چندے پریشان کرتا رہتا ہے...... بارے مَیں تو 2G سے کام چلاتا ہوں، وَلیکن شُنِید ہے کہ اہل پنجاب وسندھ ودکن وگجرات، 4G سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور خوب حظ اُٹھاتے ہیں۔''

اپنا حال کیا لکھواؤں......رمضان ہے، اور کچھ کھانے کو نہیں، سو، روزہ کھاتا ہوں اور تمھیں صبح شام یاد کرتا ہوں۔ جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد+ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ معلوم نہیں کہ تم لوگ فیس بُک پر پائے جاتے ہو کہ نہیں، ویسے جعلی کھاتے یعنی Account تو بہت دستیاب ہیں، مگر بندہ اُن پر چنداں اعتبار نہیں کرتا، بارے دھوکہ نہ ہو۔ ویسے یہ Post کرنے کی بھی خوب رہی، میاں سیدھا سیدھا، رقم کرایا۔ یا۔ نقل کرایا لکھنا تھا......خیر! اب اتنی 'فرنگیت' تو رَوا ہے۔

یہ 'فرنگیت' ابھی ابھی وضع کی ہے، کہو کیسی لگی یہ ترکیب؟ نہ ہوئے میرزا قتیلؔ آس پاس، ورنہ یہاں بھی اپنی فارسی دانی کا رعب گانٹھتے اور ہماری سبک ہندی وایرانی کی بحث بارِ دیگر چھِڑ جاتی تو نہ معلوم کتنے ہی ٹیلی وژن چینلز کی شہ سرخیاں بنتیں...... کچھ یوں بھی ہوتا کہ 'ایک میرزا نے دوسرے میرزا کی علمی قابلیت کو چیلنج کر دیا'......'میرزا اسد اللہ خان غالبؔ آج شام سات بجے اپنے مؤقف کی وضاحت کے لیے نیوز کانفرنس کریں گے'......'میرزا نوشہ نہ مانے تو اُنہیں عدالت عظمیٰ المعروف Supreme Court میں گھسیٹوں گا......میرزا قتیل کا بیان'......وغیرہ......

مستزاد: یہ ممکن ہے کہ میں ایسی صورتِ حالات دیکھ کر، ٹیلی وژن چینلز کی یلغار سے بچنے کے لیے اپنا یہ شعر پیش کر کے

جان چھڑالوں: یارب نہ وہ سمجھتے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات + دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اَور...... ویسے بھی ان چینلز میں ایسا ایسا نمونہ بیٹھا ہے کہ انسان شاعری بھول کر گالی گفتار پر اُتر آتا ہے...... ہاں وہ کچھ پری چہرہ ایسے ضرور ہیں کہ جنہیں دیکھ کر بے اختیار، مجسم کاغذی پیرہن' کہنے کو جی چاہتا ہے......اب اس بات پہ کہیں تمہارے یہاں کا وہ خدائی فوجدار، وہ کیا کہتے ہیں، PEMRA خبر نہ لے ہماری۔

لومَیں بھی کیا باتیں کرنے بیٹھ گیا، گویا حکیم احسن اللہ خان کی صحبت کا بُرا اثر پڑ گیا ہے......وہ بھی کوئی آدمی ہے، جو آم نہیں کھاتا، بلکہ (بقول عزیزی سہیل احمد صدیقی) ''آم شریف'' نہیں کھاتا......آہا کیا یاد دلایا'......میں شاید اُس کم بخت کا یہ جرم معاف کردیتا کہ مجھ جیسے' آدھے مسلمان' کو سرکارِ انگلشیہ کے ہاتھوں، جھوٹی مخبری کرکے، گرفتار کروادیا، مگر یہ کیا کہ آم کی توہین کردی...... اور سنو حالؔی! تم لاکھ غزل کی زلفیں سنوارو، میں تمھیں ایک انوکھی دعوت دے رہا ہوں، اور خاص کر تمہیں......کہ تمہیں بہت شوق ہے اصلاح کا......تو خبر یہ ہے کہ ان دنوں ''مجازی'' مشاعروں کی دھوم ہے۔ ہاں تم بھی سنو، مجروحؔ اور تفتہؔ......سیاحؔ سے تو کچھ اور بات کروں گا آگے......اب تم سوچ میں گویا مبتلا ہوگئے ہوگے کہ یہ کیا بلا ہے؟ میاں! ایک چیز ہے......Virtual......نام لیتے ہوئے جان جاتی ہے۔

کیا ثقیل لفظ ایجاد کیا ہے فرنگیوں نے...... ہاں بس وہ لال پری کی ایجاد تک...... یقیناً اہل ہند سے کہیں آگے ہیں۔ تو مَیں کہہ رہا تھا کہ Virtual یا Online ایک چیز ہے جس کا خوب چرچا ہے، اِن دنوں......تو مجھے سمجھانے کو عزیزی سہیل نے یہ ترجمہ کر ڈالا' مجازی'......اب ہمیں دعوت ملی ہے کہ کل شب نو بجے، مجازی مشاعرے میں صدارت فرمائیں اور اپنے کلام سے نوازیں۔ تم لوگوں کو اگر اس میں کچھ دل چسپی ہو تو تمہارے نام بھی لکھوادوں؟

سوچتا ہوں کہ اس مجازی مشاعرے میں اپنا کچھ نیا کلام پیش کروں، کچھ کرونا اور اُس کے متعلقات پر مبنی......مگر تعارف میں تو یہی کہوں گا کہ ؎ ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی + کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

میر مہدی مجروحؔ تمہیں یہ سن کر یقیناً صدمہ ہوگا کہ اب تمہارا نام لیوا کوئی نہیں۔ اِدھر عوام الناس میں مجروحؔ سلطان پوری کا نام بہت مقبول ہوچکا ہے اور کوئی ایک عجیب سا طبقہ ہے جو اپنے کو' ترقی پسند' کہتا ہے اور کہنے والے کہتے ہیں کہ تمہارے یہ ہم نام بھی وہی تھے یعنی اُسی طبقے کے......لو میاں! یہ ترقی پسندی کی بھی ایک رہی۔ بھئی اگر شاعر یا ادیب ترقی پسند نہیں کرتا تو کیا رجعت پسند ہوتا ہے۔

ہمیں بھول گئے کیا......ہم نے تو سید احمد کو، آئینِ اکبری' کے کام پر کیا کچھ نہ سنائی تھیں؟......لو یہ شعر سنو ہمارا اور بتلاؤ

کہ آج کے کسی ترقی پسند کے کلام سے کہیں کم تر ہے کیا: ۔ تو وہ بَد خو کہ تحیرّ کو تماشا جانے+غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے......

میاں سہیل! خیال کیجو! کہیں یہ شعر بھی تمہارے فیس بکی نقال، اپنے فیضؔ صاحب سے منسوب نہ کر دیویں۔

اور تو خیر کیا کہوں...... میرے اشعار کے ساتھ ان دنوں فیس بک اور دیگر مقامات پر وہ معاملہ ہو رہا ہے کہ غنیم کے ساتھ بھی نہ ہو۔ ہر بار جب سال نیا شروع ہونے لگتا ہے تو کم بخت میرا یہ شعر خوب خوب نقل کرتے پھرتے ہیں: دیکھیے، پاتے ہیں عُشّاق بُتوں سے کیا فیض+ اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔ یوں بھی اب میرزا نوشہ کے مقلدین تھوڑے ہیں، سمجھ کے پڑھنے والے خال خال ہیں۔ جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ+ کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی۔

یہ ہمارا نمائندہ سہیل احمد صدیقی، اپنی تدریس، تحریر و تقریر میں جا بجا کہتا پھرتا ہے کہ 'غالبؔ ہر دور میں غالب ہیں اور ہر دور پر غالب!'...... آہا آہا یعنی وہ جو ہم نے کہا تھا کہ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے+ کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور...... تو گویا اس پر صادق آیا۔ اور میاں ہم نے جو کہا تھا کہ ع میں بلبلِ گلشن نا آفریدہ ہوں...... تو اُس وقت سامعین کو تشویش ہوئی تھی کہ یہ کیونکر...... بھئی ہمارے حینِ حیات تو ناقدین یوں درجہ بندی کیا کرتے تھے: ذوقؔ، مومنؔ اور پھر غالبؔ...... اب سنتے ہیں کہ ترتیب بالعکس یا برعکس ہوگئی ہے: غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ...... استادِ شہ کی تو خیر، مگر بے چارا مومنؔ...... ہائے ہائے...... وہ اس بحث میں مارا گیا۔ کیا خوب شعر کہتا تھا۔ تم مِرے پاس ہوتے ہو گویا+ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا...... واللہ! یہ فرد ہی اکیلا اس لائق ہے کہ میں اپنا پورا دیوان اس کے عوض اُسے بخشنے کو تیار ہوں۔ صاحبو! مقطع میں اپنے تخلص کا ایسا عمدہ استعمال تو ہم نے کبھی سنا نہ دیکھا، جو مومنؔ کا خاصہ تھا۔ خیر ہوتا ہے، یہی دستورِ زمانہ ہے کہ گندم کے ساتھ گھن بھی پِستا ہے۔

تفتہؔ! بھئی معاف کرنا ویسے تو تمہارا نام بھی چنداں مشہور نہیں رہا، مگر میں نے یہ سوچ کر تمہیں اس پیغام میں شامل کیا کہ تمہارے توسط سے تمہارے کچھ نادان ہم مذہب دوستوں کو مخاطب کر سکوں۔ تمہیں پتا چلا...... وہ بابری مسجد نہ رہی...... اور تو اور...... اَب ظالم قطب مینار اور مسجدِ قوت الاسلام کے درپے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے مندر تھا۔ میاں تفتہؔ! تم نے ہماری محبت میں 'میرزا' بننا تو پسند کیا، اب کیا اس بابت ان نادانوں کو سمجھانا پسند نہ کرو گے؟

ہاں بھئی میاں داد خان سیاحؔ! اب تم سے کلام ہو جائے۔ ہمارے اس دارِ فانی سے کوچ کرنے کے مدتوں بعد، تمہارا وہ قیس والا شعر تو مشہور رہ گیا، مگر لوگ اب بھی یہ بات کم کم جانتے ہیں کہ تم ''قلب ساز'' تھے۔ (قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو+خوب گزرے گی جومل بیٹھیں گے دیوانے دو)۔ آپس کی بات ہے۔ ان دنوں یہاں جو گرانی ہے، بازار میں ہر طرف...... تو بندہ یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہے کہ میاں سیاحؔ! ایک بار پھر یہی کام شروع کرو، بہت وسعت سے کرو تا آں کہ مخلوق کو فیض پہنچے۔ اور

ہاں تم یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر، انصاف وقانون کے کرتا دھرتا اپنے تئیں دوست کر کے، بہت کامیابی سے کرلو گے...... یہ انگریز بہادر کی حکومت نہیں کہ جلد گرفتاری کا خدشہ ہو۔ (''قلبِ ساز''یعنی جعلی کرنسی کا کام کرنے والا)۔

عزیزو! ان دنوں ہر طرف بندش عامہ کا دور دورہ ہے۔ تم لوگ تالہ بندی (ترکیب) کو سہل جانو تو یہی اختیار کرو...... خیر شاگردانِ عزیز! تم سب کو یک جا مخاطب کرنے کا سبب یہ ہوا کہ WhatsApp پر کام، وہ بھی ازخود کرنا اور اس عمر میں، چنداں آسان نہیں۔ ایک مدت کے غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام اپنے مداحین (از قسمے سہیل احمد صدیقی) سے کرانا ہی بہتر ہے، کم از کم اردو سے فرنگی زبان میں، بہ سرعتِ تمام، جست لگا کر داخل ہونا، پھر گویا زقند بھر کے، دوبارہ اردوئے معلّٰی کو رجوع کرنا میرے لیے اس کہنہ سالی میں کارعبث ہے۔ ہاں رخصت ہوتے ہوئے یہ بھی کہتا چلوں کہ ناامیدی ہرگز شعارِ مرداں نہیں، بلکہ شعار موموناں نہیں!

؎ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی ایک خبر ہے زبانی طیور کی

(غالب بتوسط زباں فہم سہیل احمد صدیقی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میرا خط مرزا غالب کے نام، اردو کے موجودہ مسائل پر

مدثر شاداب

اے شاعرِ بے بدل! اے مرد ِشہِ شاعراں! مرزا نوشہ و دبیر الملک و نجم الدّ ولہ ونظام جنگ یعنی مرزا اسداللہ خاں غالب! ذرا سنیے! وہ اردو کہ رشکِ فلک تھی آج خلفشار کا شکار ہے۔ اہلِ زبان کا ناطقہ بھی سر بہ گریباں ہے۔ ایک طبقہ ہر بے قاعدگی کو اردو میں روا رکھنے پر مصر ہے کہ یوں ہی اردو کا دامن وسیع ہوگا۔ دوسرا طبقہ سنجیدگی سے قواعدِ اردو کوملحوظِ خاطر رکھنے پر زور دیتا ہے۔ اساتذہِ فن بھی آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اب ایسے میں کس سے رجوع کرنا چاہیے؟ بندہ عالمِ بے بسی میں نامہ لکھ رہا ہے۔ ان سوالات کے تشفی آمیز جوابات مرحمت فرمایئے:

آزادنظم اور معرّیٰ نظم کا کیا جواز ہے اور نثری نظم آیا نظم کہلانے کی حق دار ہے بھی یا نہیں؟ میر کے زمانے میں ہند میں اڑھائی شاعر موجود تھے۔ اب کتنے ہوگئے ہیں یا کتنے رہ گئے ہیں؟ پاکستانی مشاعروں کا معیار کیا ہے؟ حقیقت بیان کیجیے۔

پھر یہ کہیے کہ حروف تہجی کی حتمی تعداد کیا ہے؟، مرکب حروف کو حروف تہجی میں ملانا چاہیے یا ٹکسال باہر کرنا چاہیے؟ الف ممدودہ بارے کیا خیال ہے اور ہمزہ (ء) کا کیا کرنا ہے اور کہاں کہاں برتنا ہے؟ عربی کے موٗردالفاظ کے آخر میں الف مقصورہ اوری کو ہٹا کر الف سے لکھنا کیسا ہے؟ غلط العام کیا واقعی فصیح ہیں نیز الغلط العوام کا کیا کرنا ہے؟ نون غنہ کو حرف سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان یہ کیسی آویزش ہے؟ اور دوچشمی ھ اور ہائے ملفوظی میں یہ کیسا خروش ہے؟ انگریزی الفاظ کا اردو میں بجا و بے جا استعمال کیسا ہے؟ مفصل لکھیو۔

اے معلمِ ریختہ! کیا ہمیں دبستان دہلی اور لکھنؤ کا اتباعِ محض کرنا چاہیے یا اپنا پاکستانی دبستان قائم کرنے کی اجازت ہے؟ ادارہ فروغ قومی زبان اور اکادمی ادبیات کیسا کام کر رہے ہیں؟ کیا آپ کی طبیعت ان سے مطمئن ہے؟ انجمن ترقی اردو کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟ اقبال اکیڈمی اقبال سے انصاف کر رہی ہے یا نہیں؟ مجلس ترقی ادب کی کاوشوں پر رائے دیجیے۔ غالب اکادمی آپ کے شایانِ شان ہے کہ نہیں؟ اگر نہیں تو اسے گرا کر دوبارہ آپ کی مرضی کے مطابق استوار کیا جائے۔ گلزار کی فلم ''غالب'' دیکھی ہو گی اس کے محاسن و معائب بھی مفصل لکھ دیجیو تا کہ بہتر فلم تیار کی جا سکے۔

اے صاحبِ اردوئے معلّٰے! کون سے لغت پر اعتبار ہے اور کس لغت سے دور رہنا بہتر ہے؟ مدارس و جامعات میں اردو تدریس

کی جہات درست ہیں یا کسی انقلاب کی ضرورت ہے؟ نوری نستعلیق کا استعمال ٹھیک ہے یا کوئی اور راہ اختیار کرنی چاہیے؟ متروک الفاظ کے لغت پر کام کہاں تک پہنچا؟ ان تمام سوالات کے جوابات عنایت فرما کر ممنونِ احسان کیجیے۔

زیادہ آداب

والسلام

مدثر حسین شاداب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: محمد زین (سال سوئم)

ولی

ایک دن بادشاہ کے حضور میں مرزا صاحب بیٹھے تھے۔ بادشاہ نے کہا ''مرزا کوئی نیا کلام سناؤ''

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہ مسائل تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بہادر شاہ نے ہنس کر فرمایا ''بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے'' مرزا بولے ''حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ کہیں میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔''

تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک

غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

(اسداللہ خان غالبؔ)

مرزا غالب کا جوابی خط، اردو کے مسائل بارے اٹھائے گئے میرے سوالات پر

مدثر حسین شاداب

ہاہاہاہا۔۔۔۔۔ مار ڈالا یار تیرے سوالوں نے۔ یہ تم کن جھمیلوں میں پڑ گئے ہو۔۔۔؟؟؟ دیکھو تو اتنی سی صورت نکل آئی ہے۔ شاداب پھنسا ہو گرداب میں، یہ ہمیں منظور نہیں۔ اسمِ با مسمّٰی رہا کرو، مصیبت میں راحت کے مزے لیا کرو۔ تم جانو، تمھارے مکتوب کی آمد سے دو دن ادھر تمھارے ملک سے ایک وفد میرے پاس آیا۔ انھوں نے تمھارے خلاف شکایتوں کے دفتر میرے حضور کھول دیے۔ ان نے کہا" مرزا دیکھیے یہ لڑکا ہماری غلطیاں نکال نکال خود بھی ہلکان ہوا جاتا ہے اور ہماری رہی سہی عزت بھی تار تار کیے دیتا ہے۔ آپ ہی اسے لگام دیجیو۔ ہم سے تو یہ خار کھاوے ہے۔ اور پھر کئی روز تک منھ بسورے ہے"

اب سنو!۔۔۔۔۔ وہ سب ٹھیک ہے جو اردو کے مزاج کے موافق ہے اور وہ سب غلط ہے جو اردو کی شان کے مخالف ہے۔ تم غلط العام کو فصیح شوق سے کہو مگر اندھیر نہ کرو۔ تم خود کو اردو میں ڈھال لو بلکہ خود اردو سمان بن جاؤ پھر سب غموں سے آزاد ہو جاؤ گے۔

کیا پوچھا؟۔۔۔ آزاد، معرا ی اور نثری نظم؟؟؟ تم پہلے "نظم" کے معانی پر غور کر لو امید ہے تسلّی ہو جاوے گی۔ باقی بازار میں ہر شے کی دکان لگی ہے اور بکری بھی ہووے ہے۔ ہم دکان بڑھا نہیں سکتے۔۔۔ تم نے شاعروں کی تعداد پوچھی تو اب اتنی خلقت میں شاعر شماری بھلا کیوں کر کر سکتا ہوں؟؟؟ شاعروں کے ساتھ متشاعروں کی بھی فراوانی ہے۔

کیا کہا حروف کتنے ہیں؟؟؟۔۔۔ میں تمام جتن ان اردو دانوں کے دیکھوں ہوں۔ یہ ان حروف کو کھینچ کھینچ عالم بالا تک لے جاویں تو بعید نہیں۔ ہزار منھ ہزار باتیں۔ باقی ادارے اپنی دال روٹی پر قائم ہیں۔ کچھ نہ کچھ کریں ہیں تو گزر بسر ہووے ہے۔ اسی دال روٹی نے ہم سے بھی وہ قصیدے لکھوائے کہ اب پڑھ پڑھ حجاب آوے ہے۔ بھلا ہو غالب اکادمی بنانے والے کا کہ بندہ ناچیز کو آنکھوں پہ بٹھا رکھا ہے۔ پتھر پڑیں مجھ پر جو ان کی گردن زنی کروں۔ اور وہ "غالب" فلم دیکھ دیکھ تو میں بار ہا لوٹ پوٹ ہوا۔ خدا گل و گلزار کو سلامت رکھے۔

اور میاں! دبستان بنائے نہیں بنتے، مثلِ حباب خود ہی بنتے ہیں اور آپ ہی بصورتِ دودِ چراغِ محفل معدوم ہو جاتے ہیں۔ تم لغت کا پوچھتے ہو تو سنو اگر تم فی زمانہ کسی ایک لغت پہ تکیہ کرو ہو تو تمھاری فکر خام ہے۔ باقی تمھارے مدارس و جامعات کا کیا

مذکور، تم جانو مدارس میں اردو سوتیلی ماں ہے اور انگریزی اس کی سوکن۔۔۔۔ بچے در بدر ہیں۔۔۔۔ جامعات کا معاملہ جدا ہے۔ نوری نستعلیق خوب ہے اسے ہی برتا کرو، گُلوں کی مانند ہنسا کرو۔ متروک الفاظ کے لغت پر ایک جلد منشی شیونرائن کو دے بھیجی ہے۔ باقی جلدیں بھی بڑی تقطیع میں تیار کر کے جلد بھیجوں گا۔ رہے نام اللّٰہ کا۔

غالبؔ

یوم آدینہ

محلّہ بلی ماراں، دلّی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لطیفہ

انتخاب: علی حیدر شاہ (سال دوم)

مکان کی تلاش

ایک دفعہ مرزا صاحب مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان خود بسا کر دیکھا مگر اس کی محل سرا نہ دیکھ سکے۔ اس کو دیکھنے کے لیے اپنی بیوی کو بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تو ان سے مکان کی کیفیت پوچھی۔ انہوں نے کہا اس مکان میں تو لوگ '' بلا'' بتاتے ہیں۔ مرزا صاحب بولے۔ ''کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی '' بلا'' ہے۔

اسد اللہ خان غالبؔ

﴿......انتخابِ کلام غالب......﴾

غزل

انتخاب: رضاالحسن (سال دوم)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غزل

انتخاب: حسنین علی (سال اوّل)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مِرا رنگ زَرْد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خُوں ہے اب
اِس رہگزر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دِل بھی اگر گیا تو وُہی دِل کا درد تھا
احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نوَرد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆☆☆

غزل

انتخاب: حسیب احمد (سال اوّل)

عِشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مِری، صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دِل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام
مِٹ گیا گھسنے میں اِس عُقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اِس قدر دُشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضُعف سے گریۂ مُبَدَّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دِل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخُن کا جُدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کُھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہت گُل کو ترے کُوچے کی ہَوَس
کیوں ہے گردِ رہِ جَولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کُھلے اِعجازِ ہوائے صَیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل، ذُوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وَا ہو جانا

☆☆☆☆☆

غزل

انتخاب: شیراز علی (سال دوم)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا
فکرِ نالہ میں گویا، حلقہ ہوں زسر تاپا
عضو عضو جوں زنجیر، یک دل صدا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا
شب نظارہ پرور تھا، خواب میں خیال اُس کا
صبح موجۂ گُل کو وقف بوریا پایا
جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادن دل ہے
زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دلکشا پایا
ہے نگیں کی پاداری نام صاحب خانہ
ہم سے تیرے کوچے نے نقشِ مدعا پایا
دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالۂ نارسا پایا
نے اسد جفا سائل نے سم جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا اُلفت آزما پایا

غزل

انتخاب: حبیب اللہ (سال دوم)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا، کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو، "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے، گویا، کوئی دن اور
ہاں، اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے، مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا، کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے دادوستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہ ہر حال یہ مدت، خوش و ناخوش
کرنا تھا، جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں، غالب!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غزل

انتخاب: عبدالرحمٰن (سال اوّل)

کی وفا ہم سے تو غیر اِس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطِر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اَور پھر کون سے نالے کو رَسا کہتے ہیں

ہے پَرے سرحدِ اِدراک سے اپنا مَسجُود
قِبلے کو اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دِل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نام خدا! کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نُوا کہتے ہیں

☆☆☆☆☆

غزل

انتخاب: ناصر سہیل (سال سوئم)

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں ، حَرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فُروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دَشنہ غمزہ جاں سِتاں، ناوَکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِحیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نَجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بو الہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عِزّ و ناز، یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روییے زارزار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

☆☆☆☆☆

غزل

انتخاب: میر حمزہ (سال چہارم)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خوں کرنیکی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

☆☆☆☆☆

غزل

انتخاب: ارسلان عابد (سال سوئم)

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینۂ خوشا لذّت فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی!
وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھیئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مِری کوے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوس بال و پَرُ گئی
دیکھو تو دِل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی
ہر بو الہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا داں نقاب کا
مستی سے ہرنگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے اسؔد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

غزل

انتخاب: علی حسن شاہ (سال چہارم)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازئ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں خامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزُو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پر نگاہ
چہرہ فروغ مَے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

﴾......انتخابِ خطوطِ غالبؔ......﴿

(۱)

بنام نواب علاؤالدین احمد خاں علائی

انتخاب: محمد بلال ظفر (سال دوم)

سبحان اللہ، ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو۔ یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ ''دساتیر'' اور ''برہانِ قاطع'' کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ از آں جملہ ''برہانِ قاطع'' تم کو دے چکا ہوں۔ ''دساتیر'' میرا ایمان وحرزِ جان ہے۔ اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی، کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، ہزل وہجو میرا آئین نہیں، پھر کہو، کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف وجوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں، باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا۔ تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اُردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے، وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرقومۂ روز دوشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء (۱)

(۲)

بنام منشی ہرگوپال تفتہؔ

انتخاب: محمد باذل خان (سال سوئم)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہ ہر حال مجھ کو کہ نالائق وذلیل ترین خلائق

ہوں' اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں' اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظؔ کی' بہ موجب فرمایشِ جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اُس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر، تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر، اُس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں۔ ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیلؔ کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے' وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہنچائیں گے؟

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماءالجبن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طبِ محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے مگر اثر اُس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اُس میں سیر پانی تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اُس کو جوش کریں؛ اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اُس باقی پانی کو چھان کر، کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے، اُس کو پییں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات، جب پیاس لگے، یہی پییں۔ تبرید کی حاجت پڑے، اسی پانی میں پییں۔ روز جوش کروا کر، چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اُس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا اسلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے اُن کو اختیار ہے۔ مئی ۱۸۴۸ء

(۳)

بنام میر مہدی مجروح

انتخاب: اسداللہ (سال دوم)

میاں کس حال میں ہو کس خیال میں ہو کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے یہاں اُنکی سُسرال میں قصہ کیا کیا نہ ہوئے

ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے خوشدامن صاحب بلائیں لیتی ہیں سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں بی بی مانند صورت دیوار چپ جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ وہ تو غنیمت تھا شہر ویراں نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا دہ روپے خرچ راہ دیے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لینگے اور تم سے صرف پانچ روپیہ ظاہر کریں گے اب سچ جھوٹ تم پر کھل جاوے گا دیکھنا یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمہاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے بھائی میں دلی سے آیا ہوں قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں زنہار نہ باور کیجیو مال مفت سمجھ کر لے لیجیو کون گیا ہے کون لایا ہے کلوایاز کے سر پر قرآن رکھو کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک اُن کو پہو نچا گئے رسم مشایعت عمل میں آئی اب کہو بھائی کون برا اور کون اچھا ہے میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے یہ لوگ تو ان پر اپنی جان نثار کرتے ہیں عورتیں صدقہ جاتی ہیں مرد پیار کرتے ہیں مجتہد العصر سلطان العلما مولانا سرافراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو میاں کس قصے میں پھنسا ہے فقہ پڑھ کر کیا کریگا طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

(۴)

بنام میر مہدی مجروح کے نام

انتخاب: علی رضا (سال چہارم)

بھائی! کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں؟

(تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا میں نے سنا تھا، وہ البتہ موجبِ تشویش تھا۔ تمہاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہو گئی، پھر تم کیوں ہائے واویلا کرتے ہو؟ اوپر کا حاکم موافق ہے، ماتحت کا حاکم جو مخالف تھا سو گیا۔ پھر کیا قصہ ہے؟)

''قاطع برہان'' کے مسودے سب میں سے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی، وہ تحریر بالکل

مغشوش ہوگئی۔ ہاں، اس کی نقلیں صاف کہ جس میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کر لی ہیں: ایک میرے واسطے، ایک (بھائی) ضیاءالدین خاں کے واسطے۔ میری ملک کی جو کتاب ہے، اُس کی جلد بندھ جائے تو بہ طریقِ مستعار بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھر دینا، اور یہ امر بعد محرم واقع ہوگا۔ مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے، صرف ''برہان قاطع'' کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اُس کو مانے گا؛ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فنِ لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اُس کو لگاؤ ہو، اساتذہ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

''فہمائش'' کا لفظ میاں بدھا ولد میاں جما اور لالہ گنیشی داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زبان سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو؛ امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں۔ ''سوختن'' مصدر، ''سوزد'' مضارع، ''سوز'' امر، ''سوزش'' حاصل بالمصدر۔ اسی طرح ہیں: ''خواہش'' و ''کاہش'' و ''گزارش'' و ''گدازش'' و ''آرائش'' و ''پیرائش'' و ''فرمائش''۔ ''فہمیدن'' فارسی الاصل نہیں ہے، مصدر جعلی ہے۔ ''فہم'' لفظ عربی الاصل ہے۔ ''طلب'' لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافقِ قاعدۂ تفریس ''فہمیدن'' و ''طلبیدن'' کر لیا ہے۔ اور اس قاعدہ میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصلی عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ ''فہم'' یعنی ''بفہم'' ''سمجھ''۔ ''طلب'' یعنی ''بطلب''، ''مانگ''۔ ''فہمد'' مضارع بنا، ''طلبد'' مضارع بنا، خیر یہ فرض کیجئے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنا لیں۔ سنو، حاصل بالمصدر ''فہمش'' اور ''طلبش'' ہونا چاہیے۔ ''فہم'' تھا صیغۂ امر، ''فہمد'' سے نکلا تھا، الف اور 'ے' کہاں سے لایا؟ ''فہمائے'' تو نہیں، جو ''فہمایش'' درست ہو۔ کہیں ''فرمایش'' کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا، وہ مصدر اصلی فارسی ''فرمودن'' ہے، فرماید، مضارع، ''فرمائے'' امر، حاصل مصدر ''فرمائش''۔

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد۔ میاں! میں نے رات کو اپنے عالمِ سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا۔ ''میر کاظم دین'' کے بارہ سو چھتر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ ''فہمایش'' ٹکسال سے باہر ہے۔

غالبؔ

(جولائی ۱۸۵۹ء)

(۵)

مرزا حاتم مہر تخلص کے نام

انتخاب: احمد (سال دوم)

مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو کیا تم نے مجھ سے بات کرنیکی قسم کھائی ہے اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہو کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہو مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہونچ جائینگی اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئینگی ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو خدا کرے اُن تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا ضیاء الدین خان اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انہوں لکھ لیا اُن دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کو وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لیا اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اسکے اِس خط کا جواب چاہتا ہوں

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(۶)

بنام ہر گوپال تفتہ

انتخاب: احتشام احمد (سال دوم)

میاں!

تمہارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت

اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی! ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بے رنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں، وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں۔ لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے، ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں، مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے، اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا؟

قطعاتِ تاریخ آگرہ کیونکر بھیجوں، پھر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ 'خالق معنی بے معنیٰ' صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح 'اللہ' میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے، 'الہ اور' 'الٰہی' میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے الٰہی میں دو الف نہیں مانے تو ہم کیوں کر نہ مانئیں؟

'دویم' بروزن 'جویم' غلط، 'دوم' ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی میں لکھیں، تو 'دیم' پڑھیں گے، اگر چہ لکھیں گے دویم۔ واؤ کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں، 'دومی' درست ہے، مگر نہ بہ حذف تحتانی، مثل 'زمی' بہ حذف نون، بلکہ بہ طریق قلب بعض 'دویم' کا 'دومی' ہو گیا۔

کنویں کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخِ وفات کا اور مادہ سوچو، کسی واسطے کہ جب 'الٰہی' میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا

از غالب

روز ورد وِنامہ بلکہ وقتِ ورد وِنامہ، بعد خواندان نوشتہ شد۔

(یک شنبہ ۱۸۵۹ع)

(۷)

بنام نواب علاء الدین خاں صاحب

انتخاب: آصف علی (سال سوئم)

صاحب!

آگ برستی ہے، کیوں کر آگ میں گر پڑوں؟ مہینا، ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو، دے و بہمن بہت دور ہے، آبان و آذر میں بشرط حیات قصد کروں گا۔

یہ چند ورق یوسف مرزا نے از روئے 'دہلی اردو اخبار' کاتب سے لکھوا کر رکھے تھے اور میرے پاس پڑے ہوئے تھے۔ ثاقب کو دیے تا کہ وہ کسی آدمی کے ہاتھ تم کو بھیج دے اور تم میری طرف سے میرے بھائی اور اپنے والد ماجد کو دو۔ جب اُٹھا کر دیکھا کریں گے تو کوئی منٹ کی دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائیں گے۔

یہ سطریں جواب میں ہیں تمہارے اس خط کے جو آج اس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز، دوشنبہ، ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ع

(۸)

بنام یوسف مرزا صاحب

انتخاب: قاسم علی (سال چہارم)

کوئی ہے! ذرا یوسف مرزا کو بلائیو! لو صاحب! وہ آئے۔

میاں! میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو: تفضّل حسین خاں اپنے ماموں مؤید الدین خاں پاس میرٹھ ہے، شاید دلی آیا ہو مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد اُن کے غلام علی خاں اکبر آباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں، لڑکے پڑھاتے ہیں، روٹی کھاتے ہیں۔

تم لکھتے ہو کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتے گئے۔ تمہارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس آ گئے۔ اس خبر کو اُس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ ادھر سے آپ

بنارس کو چلے ہوں، ادھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو، مگر میری جان ہم کو کیا؟

عالم پس مرگِ ما چہ دریا چہ سراب

(بعد ۱۴ اپریل ۱۸۵۶ء)

(۹)

بنام منشی شیونرائن کے نام

انتخاب: محمد عبداللہ (سال دوم)

برخوردار، منشی شیونرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔

کیا میرے خط نہیں پہنچتے کہ، جواب ادھر سے نہیں آتا؟ دو مجلد 'بغاوت ہند' کے زیادہ پہنچے ہیں، اس کے واسطے تم سے پوچھا گیا تھا، اُس کا جواب بھی نہ آیا۔ میں نے یوسف علی خاں عزیز کے خط میں کچھ عبارت تمہارے نام لکھی تھی۔ کیا اُنہوں نے تم کو نہ پڑھائی ہوگی؟ اُس کا بھی تم نے جواب نہ لکھا۔ ولایت عرضی اور کتاب کے باب میں تو میں کچھ کہتا ہی نہیں جو اُس کا جواب مانگوں، کچھ مجھ سے خفا ہو گئے ہو تو ویسی کہو۔ یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ تم کو تقاضا معلوم ہو۔

اے لو، ایک اور بات سنو؛ تمہارا تو یہ حال کہ مجھ کو خط لکھنے کی گویا تم نے قسم کھائی ہے اور میری یہ خواہش کہ نواب گورنر جنرل بہادر کی خبر جو وہاں تم کو معلوم ہوا کرے، مجھ کو لکھا کرو۔ خصوصاً اکبر آباد میں آ کر جو کچھ واقع ہو وہ مفصل لکھو۔ آیا جناب لفٹنٹ گورنر بہادر بھی ساتھ آئیں گے یا جدا جدا آ کر یہاں فراہم ہو جائیں گے؟ دربار کی صورت، خیر خواہوں کے تقسیم انعام کی حقیقت، کوئی نیا بندوبست جاری ہو اُس کی کیفیت، یہ سب مراتب مجھ کو لکھا کرو۔ دیکھو! خبردار، اس امر میں تساہل نہ کرنا۔ اب کیا سنتے ہو، لکھنؤ سے کہاں آئے ہیں؟ کان پور فرخ آباد ہوتے ہوئے آگرہ آئیں گے۔ کہاں کہاں، کون کون رئیس آ ملے گا۔ لکھنؤ کے دربار کا حال جو کچھ سنا ہو وہ لکھو۔ اگرچہ یہاں لوگوں کے ہاں اخبار آتے رہتے ہیں اور میری بھی نظر سے گزر جاتے ہیں، مگر میں چاہتا، ہوں کہ تمہارے خط سے آگہی پاتا رہوں۔ تم جو لکھو گے، منقح اور مفصل لکھو گے۔ یقین ہے کہ برادرزادۂ عزیز یعنی تمہارے والد ماجد نے مرزا یوسف علی خاں کے کام کی درستی لالہ جوتی پرشاد کی، سرکار میں کر دی ہوگی، اس کی بھی اطلاع ضرور ہے۔

جواب کا طالب غالبؔ

(صبح چہار شنبہ، ۲، نومبر سنہ ۱۸۵۹ع)

(۱۰)

بنام علاؤالدین احمد خاں

انتخاب: عبادالحسن (سال دوم)

علائی مولائی! غالب کو اپنا دعا گو اور خیر خواہ تصور کریں۔ مادہ ہائے تاریخ کو نہ آپ قالبِ نظم میں لائیں اور نہ اور کو اس امرِ منکر کی تکلیف دیں۔ بھائی! سمجھو یزید پر لعن منجملہ، عبادت سہی، لیکن تقریباً کہہ دیتے ہیں کہ 'بریزید لعنت' کسی مومن نے اُس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔ اِبداعِ مادہ ہائے تاریخ تمہارے حسنات میں لکھا گیا۔ مثاب تم ہو چکے اجر پاؤ گے۔ انشاءاللہ، اب اپنے کو بدنام اور کسی کو ملول اور عداوت کو ظاہر، اور اگر ظاہر ہو تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے اُنہتر واں برس شروع ہوا ہے۔ اُس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے، اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جرنیل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ہیں، اُس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے، جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہو گے؟ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔

خدا ایش بیامرزاد و بدیں دروغہائے بے نمک مگیر اد

شنبہ ۹ جولائی سنہ ۱۸۶۴ء

غالبؔ

غالبؔ کے لطیفے

انتخاب: بلال انور (سال سوم)

تُف بریں وبا

ایک دفعہ دہلی میں وبا پھیلی میر مہدی مجروحؔ نے بذریعہ خط مرزا سے پوچھا کہ حضرت وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی موجود ہے۔ مرزا صاحب نے جواب لکھا۔ "بھئی کیسی وبا جب مجھ سے چھیاسٹھ برس کے بڈھے اور چوسٹھ برس کی بڑھیا کو نہ مارسکی۔ تو تُف بریں وبا۔"

انتخاب: فیض رسول (سال چہارم)

شیطان غالب ہے

رمضان کا مہینہ مرزا نواب حسین مرزا صاحب کے یہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے انہوں نے متعجب ہوکر پوچھا "قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔" مسکرا کر بولے "شیطان غالب ہے"

انتخاب: محمد سجاد (سال اوّل)

میاں مٹھو

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک طوطا پنجرے میں سردی کے مارے پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب طوطے سے کہنے لگے "میاں مٹھو تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو۔"

کتابیاتِ غالبؔ

کلیم احسان بٹ

غالبؔ پر بہت لکھا گیا۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی میں شروع ہوا اور ابھی تک جاری وساری ہے۔ نصابی ضروریات کے تحت لکھی گئی کتب دھڑا دھڑ چھپتی اور فروخت ہوتی ہیں۔ دیوان غالبؔ سینکڑوں اشاعتی اداروں نے چھاپ رکھا ہے۔ یہی حال خطوط کا بھی ہے یعنی خطوط کے بھی غیر مستند مجموعے چھپتے رہتے ہیں۔ نصابی اہمیت کی کتب کی بھی یہی صورت ہے۔ اس طرح غالبؔ کے متعلق بعض کتب مختلف اوقات میں مختلف اداروں سے بار بار چھپی ہوئی مارکیٹ میں موجود ہیں۔ اگر اس رطب ویابس میں سے غالبؔ پر مستند اور معیاری کام کی مقدار دیکھی جائے تو وہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ نہ صرف رسائل وجرائد میں سینکڑوں مضامین بلکہ غالبؔ کے خاص نمبروں کی اشاعت کے باوجود کتابی شکل میں غالبؔ پر مواد کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ دو سے زاید صدیاں گزر جانے کے باوجود غالبؔ پر لکھی گئی کتب کی تعداد ابھی تک سینکڑوں میں ہے۔ میرے خیال میں ابھی غالبؔ پر لکھنے کی بہت گنجائش اور ضرورت موجود ہے۔ اب تک غالبؔ اور غالبؔ کے بارے میں چھاپی گئی کتب کی ایک نامکمل فہرست حاضر ہے۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ اسے مکمل کرنے میں معاونت فرمائیں اور مصنفین ومحققین سے استدعا ہے کہ اس میں اضافے کی کوشش کریں تا کہ اردو ادب کے اس نابغہ روز شخصیت کی کما حقہ پذیرائی کی جا سکے۔

نام مصنف	نام کتاب	ادارہ/مطبع	اشاعت
اثر لکھنوی	مطالعہ غالب	دانش محل لکھنؤ	سن ندارد
ابراہیم افسر	رشید حسن خاں کی غالب شناسی	ابراہیم افسر	2020
ابن حسن قیصر	غالب نما	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
ابومحمد سحر ڈاکٹر	غالبیات اور ہم	تخلیق کار پبلشرز۔ دہلی	1994
اثر فاضلی	باقیات غالب	ادارہ فکر ونظر کراچی	1991
اثر لکھنوی	مطالعہ غالب	دانش محل لکھنؤ	1957
احتشام حسین سید	غالب کا تفکر	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	

احسن الظفر سید ڈاکٹر	بیدل اور غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2012
احسن علی خان صاحبزادہ	مفہوم غالب	مکتبہ میری لائبریری لاہور	1969
احمد الدین احمد	غالب اور اس کی شاعری	اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد	1996
احمد الدین مارہروی	غالب اور اس کی شاعری	الہ آباد	1928
احمد اللہ قادری سید	مقامِ غالب	اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد	1969
احمد ظفر	غالب کی زمینوں میں غزلیات	الحمد پبلی کیشنز لاہور	1999
احمد غریب نواز خان	مختصر غالب	ملک نذیر احمد اینڈ سنز لاہور	سن ندارد
احمد فاروقی خواجہ	یادو بود غالب	ترقی اردو بیورو۔ دہلی	1993
احمد فاروقی خواجہ	اشاریہ کلام غالب	دہلی یونیورسٹی	1970
اختر حسن مترجم	چراغ دیر (منظوم اردو ترجمہ)	حیدرآباد	1974
اختر صدیقی	غالب اپنے آئینے میں	بھارتی پبلی کیشنز۔ دہلی	1970
اخلاق حسین عارف	غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں	ادارہ فروغ اردو دہلی	سن ندارد
اخلاق حسین عارف	غالب اور فن تنقید	غالب اکیڈمی نئی دہلی	1977
ارشد مسعود ہاشمی	شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی	ارشد مسعود ہاشمی	2004
اسد اللہ خان غالب	نکاتِ غالب	مطبع سراجی دہلی	1868
اسد اللہ خان غالب	نامہ غالب	مطبع محمدی دہلی	1865
اسد اللہ خان غالب	مہر نیم روز	فخر المطابع دہلی	1854
اسد اللہ خان غالب	مثنوی دعا صباح	نول کشور لکھنؤ	حیات غالب میں چھپی
اسد اللہ خان غالب	لطائف غیبی	اکمل المطابع دہلی	1865
اسد اللہ خان غالب	کلیات نثر غالب	نول کشور لکھنؤ	1868
اسد اللہ خان غالب	کلیات غالب/نواب ضیاالدین احمد نیر درخشاں	مطبع دارالاسلام دہلی	1845
اسد اللہ خان غالب	قاطع برہان	نول کشور لکھنؤ	1862

مصنف	کتاب	ناشر	سن
اسداللہ خان غالب	قادر نامہ	مطبع مزاری لال لاہور	1873
اسداللہ خان غالب	غالب کے خطوط	انوار بک ڈپو لکھنؤ	سن ندارد
اسداللہ خان غالب	عود ہندی	مطبع مجتبائی میرٹھ	1868
اسداللہ خان غالب	سوالات عبدالکریم	اکمل المطابع دہلی	1865
اسداللہ خان غالب	سبد چین	مطبع محمدی دہلی	1967
اسداللہ خان غالب	دیوان غالب	فخر المطابع دہلی	1842
اسداللہ خان غالب	دیوانِ غالب	مطبع احمدی علی گڑھ	1861
اسداللہ خان غالب	دستنبو	مفید خلائق پریس آگرہ	1858
اسداللہ خان غالب	درفش کاویانی	اکمل المطابع دہلی	1865
اسداللہ خان غالب	تیغ تیز	اکمل المطابع دہلی	1867
اسداللہ خان غالب	پنج آہنگ	مطبع سلطان دہلی	1849
اسداللہ خان غالب	اردوئے معلیٰ	اکمل المطابع دہلی	1869
اسد علی انوری سید	قتیل اور غالب	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1939
اسد علی سید	قتیل اور غالب	مکتبہ جامعہ لکھنؤ	1939
اسرار احمد	غالب کی شاعری میں تشبیہات واستعارات	دبستان۔ پٹنہ	1987
اسرار سہاروی پروفیسر	غالب نما	فروغ ادب اکیڈمی گوجرانوالہ	1998
اسلم انصاری ڈاکٹر	غالب کا جہان معنی	بیکن بکس لاہور	2015
اسلم فرخی	قتیل اور غالب	فضلی سنز کراچی	1998
اسلم فرخی	بچوں کے مرزا غالب	ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی	1993
اسیر عابد	دیوان غالب (پنجابی ترجمہ)	مجلس ترقی ادب لاہور	1997
اشرف قدسی	وفات غالب کا سواں سال	ادارہ معاشرتی بہبود ساہیوال	1969
اطہر رضوی	عالمی غالب سیمینار	جاوداں کمپوزرز۔ کراچی	1998

اظہار اللہ اظہار	نیا اور پرانا غالب	اسلامیہ کالج پشاور	2003
افتخار الدین احمد ڈاکٹر	نقد غالب	دہلی پرنٹنگ پریس دہلی	1956
افتخار عدنی غالب	شناسی کے کرشمے	ایچ وائی پرنٹرز لاہور	1995
افصہ وحید ڈاکٹر فرمان فتح پوری	بطور غالب شناس	ابلاغ پبلشرز لاہور	2002
اکبر حیدری ڈاکٹر	نوادر غالب	احمد برادرز کراچی	2006
اکبر حیدری ڈاکٹر	غالبیات کے چند فراموش گوشے	ادارہ یادگار غالب کراچی	سن ندارد
اکبر علی خان	چھیڑ غالب سے چلی جائے	کتاب کار پبلی کیشنز۔رام پور	1965
اکبر علی سید ترمذی	نامہ ہائے فارسی غالب (اردو ترجمہ)	ادارہ یادگار غالب کراچی	1999
الطاف حسین حالی مولانا	یادگار غالب	نامی پریس کانپور	1897
امتیاز علی خان عرشی	مکاتیب غالب	مطبع ۔ قیمہ۔ بمبئ	1937
امتیاز علی خان عرشی	قاطع برہان کا پہلا مسودہ	رام پور رضا لائبریری۔رام پور س۔ن۔	
امتیاز علی خان عرشی	فرہنگ غالب	ناظم برقی پریس رامپور	1947
امتیاز علی خان عرشی	انتخاب غالب	مطبع قیمہ۔ بمبئ	1942
امتیاز علی خان عرشی	انتخاب غالب	مطبع قیمہ۔ بمبئ	1942
امیر حسن نورانی	غالب کی زندگی	آزاد کتاب گھر۔ دہلی	1969
انتظام اللہ شہابی	غالب کے لطیفے	کتاب گھر دہلی	1947
انعام الحق کوثر	مرزا غالب کتابیات حصہ اول	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	1987
انعام الحق کوثر	مرزا غالب قومی و عالمی تناظر میں	تعلیمی تحقیق۔ کوئٹہ	1998
انعام اللہ خان ناصر	بیان غالب	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	سن ندارد
انوار احمد ڈاکٹر	غالب کے بہتر خطوط	بیکن بکس لاہور	2015
انور احمد علوی	غالب کے جعلی خطوط	مزاح پلس۔ کراچی	
انور احمد علوی	غالب کا دستر خوان	مزاح پلس۔ کراچی	

انور سدید ڈاکٹر	غالب کے نئے خطوط	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1982
انور سدید ڈاکٹر	غالب کا جہاں اور	کاروان ادب ملتان	1986
انور معظم	غالب کی فکری وابستگیاں	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2011
انیس شاہ جیلانی سید چھپنا	دیوان غالب نسخہ امروہہ کا	فکشن ہاؤس لاہور	
انیس ناگی	غالب کا مقدمہ پنشن	اے این پرنٹرز لاہور	1994
انیس ناگی	غالب پریشاں	مکتبہ جمالیات لاہور	1996
انیس ناگی	غالب ایک شاعر ایک اداکار	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1987
اوصاف احمد	غالب کچھ جائزے	لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ	1966
اے۔حمید	مرزا غالب رائل پارک میں	خالد بک ڈپو۔لاہور	1962
اے بی اشرف ڈاکٹر	میر، غالب، اقبال۔تقابلی مطالعہ	بیکن بکس ملتان	1977
اے بی اشرف ڈاکٹر	غالب چاور اقبال	بیکن بکس ملتان	1988
ایاز صدیقی	ثنائے محمد (غالب کی زمین میں نعتیں)	موجود نہیں	1993
ایڈیٹر آج کل	آئینہ غالب	پبلی کیشنز ڈویژن۔دہلی	1964
ایس اے مہدی	بزمِ غالب	اسرار کریمی پریس الہ آباد	سن ندارد
ایس ایم اے شاہ (مسز)	لطائف غالب	مکتبہ پنجاب لاہور	1938
ایم سراج احمد	حیات نو کا پرتو غالب	بزم اردو بنگلور	1968
ایوب صابر	انتخاب خطوط غالب	کتاب سرائے لاہور	2013
ایوب قادری	غالب اور عصرِ غالب	غضنفر اکیڈمی کراچی	1982
آسی الدنی	مکمل شرح دیوان غالب	صدیق بک ڈپو۔لکھنؤ	1931
آغا محمد باقر	بیان غالب	عالم گیر پریس لاہور	1948
آغا محمد باقر	بیان غالب	عالم گیر پریس لاہور	1948
آفتاب احمد ڈاکٹر	میر، غالب اور اقبال تین صدیوں کی آوازیں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1996

آفتاب احمد ڈاکٹر	غالب آشفتہ نوا	انجمن ترقی اردو کراچی	1989
آقائے رازی	الہامات	ایم فرمان علی اینڈ سنز لاہور	سن ندارد
آل احمد سرور	عکس غالب (انتخاب خطوط)	علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ	1973
بشیر احمد بٹ	شرح دیوان غالب	الفیصل۔لاہور	2000
بے خود دہلوی	مراۃ الغالب	مطبع کریمی پریس۔لاہور	1964
بے خود موہانی	گنجینہ تحقیق	نظامی پریس لکھنؤ	سن ندارد
بیدل فاروقی	سیر غالب	دارالحسنات سہارن پور	1969
پرتھوی چندر	مرقع غالب	لکشمی پرنٹنگ پریس دہلی	1966
پرتھوی چندر	فکر غالب	پیام وطن پریس دہلی	1960
پرتھوی چندر	حق جا گیر غالب	مکتبہ جامعہ دہلی	1968
پرتو روہیلہ	نامہ ہائے فارسی غالب (اردو ترجمہ)	ادارہ یادگار غالب کراچی	1999
پرتو روہیلہ	مشکلاتِ غالب	نقوش پریس لاہور	2002
پرتو روہیلہ	متفرقات غالب (ترجمہ اردو)	ادارہ یادگار غالب کراچی	2005
پرتو روہیلہ	کلیات مکتوبات فارسی غالب (اردو ترجمہ)	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	2008
پرتو روہیلہ	غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	2012
پرتو روہیلہ	باغ و در میں شامل غالب	بزم علم و فن اسلام آباد	2000
پرتو روہیلہ	بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے	انجمن ترقی اردو کراچی	2012
پرتو روہیلہ	آہنگ پنجم (فارسی خطوط کا ترجمہ)	ادارہ یادگار غالب کراچی	2004
پرویز انجم	منٹو غالب کا پرستار	مثال پبلشرز۔فیصل آباد	2012
پرویز انجم	سعادت حسن منٹو کی فلم مرزا غالب	بک کارنر جہلم	
پرویز نیر پروفیسر	کائنات غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	2002
پریم پال اشک	روزمرہ و محاورہ غالب	جمال پرنٹنگ پریس دہلی	1969

پریم چند منشی	آہنگ غالب	دوآبہ ہاؤس۔لاہور سن ندارد	
پورن کمار ورما	غالب شخصیت اور عہد	اردو انڈیا انٹرنیشنل دہلی	1999
تابش نقوی امروہوی	مے خانہ تہ حرف	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1996
تجسس اعجازی	غالب کی تصویر کا دوسرا رخ	دارالاحباب لکھنؤ	1969
تحسین فراقی ڈاکٹر	غالب فکر و آہنگ	اردو اکیڈمی پاکستان لاہور	سن ندارد
تحسین فراقی ڈاکٹر	دیوان غالب نسخہ خواجہ اصل حقائق	سورج پبلشنگ بیورہ لاہور	2001
تسلیم احمد تصور	غالب مزاح کی زد میں	سورج پبلشنگ بیورہ لاہور	سن ندارد
تصویر فاطمہ	غالب کی زمینوں میں پچاس سلام	احمد برادرز کراچی	1988
تنویر احمد علوی	غالب کی سوانح عمری خطوط کی روشنی میں	غالب اکیڈمی۔دہلی	2004
تنویر احمد علوی	اوراق معانی (فارسی خطوط کا ترجمہ)	اردو اکیڈمی دہلی	1992
ثاقب عمران	امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی	اتر پردیش	2018
ثمینہ ندیم ڈاکٹر	غالب تحقیقات شعر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	2020
جسارت خیالی	غالب کے نقش قدم پر	رنگ ادب، کراچی	
جعفر بلوچ/ رفاقت علی شاہد	محاکمہ دیوان غالب نسخہ لاہور	علم و عرفان پبلشرز لاہور	2001
جلیل قدوائی	کلام غالب	ادارہ نگارش و مطبوعات کراچی	1960
جمال حسین قاضی	دام آگہی (غالب مطالعات)		
جمیل شیدائی	غالب خستہ کے بغیر	اقلیم ادب حیدرآباد	1987
جوش ملسیانی	دیوان غالب مع شرح	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1997
جیلانی کامران	غالب کی تہذیبی شخصیت	خالد اکیڈمی راولپنڈی	1972
حامد حسن قادری	غالب کی اردو نثر	ادارہ یادگار غالب کراچی	2001
حامد سعید اختر	صد شعر غالب	فیروزسنز لاہور	سن ندارد
حامد علی شاہ سید ڈاکٹر	غالب کا سائنسی شعور	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1995

حامدہ مسعود	خطوط غالب۔فنی تجزیہ	طاہرہ تھانوی	1982
حامدی کاشمیری	غالب جہان دیگر	میزان پبلشرز۔کشمیر	2009
حامدی کاشمیری	اقبال اور غالب	ادارہ ادب کشمیر	1978
حبیب الرحمٰن	غالب فکروفن کے آئینے میں	مکتبہ شاہین پشاور	1976
حسام الدین راشدی پیر	دود چراغ محفل	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
حسرت موہانی	شرح دیوان غالب	الناظر پریس لکھنؤ	1916
حسرت موہانی	دیوان مع شرح	الکتاب۔کراچی	1965
حسن اختر ملک	حیات غالب کا ایک باب	مکتبہ عالیہ لاہور	1987
حسن نظامی خواجہ	غالب کا روزنامچہ	محبوب المطابع دہلی	1940
حفیظ عباسی	کہانی میری زبانی۔غالب کی آپ بیتی	مجلس اشاعت ادب دہلی	1968
حمید احمد خان پروفیسر	مرقع غالب	مجلس ترقی ادب لاہور	2003
حمید احمد خان پروفیسر	دیوان غالب نسخہ حمیدیہ	مجلس ترقی ادب لاہور	1969
حمید اللہ خاں ضیا اسلام پوری	غالب وتلمیحات غالب	گلستان پریس سرگودھا	1992
حمید اللہ شاہ ہاشمی	گفتہ غالب	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	2003
حمید یزدانی	شرح کلیات غالب فارسی	مکتبہ دانیال لاہور	2004
حنا جمشید	کلام غالب کے دو مستند شرحیں	مثال پبلشرز۔فیصل آباد	
حنیف فوق	غالب نظر اور نظارہ	ادارہ یادگار غالب کراچی	2003
حنیف نقوی پروفیسر	غالب اور جہان غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2012
حنیف نقوی پروفیسر	غالب کی چند فارسی تصانیف	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2005
حنیف نقوی پروفیسر	غالب کے فارسی خطوط	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2015
حنیف نقوی پروفیسر	غالب احوال وآثار	نصرت پبلشرز۔لکھنؤ	1990
خالد بزمی (م)	یادِ غالب	مجلس اردو لاہور	1969

مصنف	کتاب	ناشر	سن
خالد حمید ڈاکٹر	غزلیات فارسی غالب (منظوم اردو ترجمہ) بزم علم و فن اسلام آباد		2000
خالد ندیم	آپ بیتی مرزا غالب	کتاب سرائے	2019
خدا بخش لائبریری پٹنہ	زمانہ کی غالبیات	خدا بخش لائبریری پٹنہ	1994
خلیق انجم	غالب کے خطوط جلد پنجم	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	2000
خلیق انجم	غالب کے خطوط جلد چہارم	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1995
خلیق انجم	غالب کی نادر تحریریں	مکتبہ شاہراہ دہلی	1961
خلیق انجم	غالب کے خطوط جلد سوم	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1990
خلیق انجم	غالب کے خطوط جلد دوم	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1989
خلیق انجم	غالب کے خطوط جلد اول	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2000
خلیق انجم	غالب کا سفر کلکتہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2005
خلیل الرحمٰن داؤدپوری	یادگار غالب	مجلس ترقی ادب لاہور	1963
خلیل الرحمٰن داؤدی	مجموعہ نثر غالب اردو	مجلس ترقی ادب لاہور	1967
خورشید الاسلام	غالب کا نظریہ حیات	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	
خورشید الاسلام	غالب ابتدائی دور میں	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	1960
خورشید علی خاں	فکر غالب اشعار کے آئینے میں	ذیشان کتاب گھر کراچی	1997
دانیال طریر	جدیدیت مابعد جدیدیت اور غالب	انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ کوئٹہ	2013
ذاکر حسین ڈاکٹر	انتخاب غالب	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی	1970
ذکا صدیقی	کلام غالب کا فنی و جمالیاتی مطالعہ	گلشن اقبال کراچی	2006
ذوالفقار احمد قاضی	شرح دیوان غالب	مقبول اکیڈمی لاہور	سن ندارد
راغب مرادآبادی	مدحت خیر البشر (غالب کی زمیں میں نعتیں)	سفینہ اکیڈمی کراچی	1979
رشید احمد صدیقی پروفیسر	غالب کی شخصیت اور شاعری	چوہدری اکیڈمی لاہور	سن ندارد
رشید حسن خان (م)	گنجینہ معنی کا طلسم (اشاریہ دیوان غالب)	مجلس ترقی ادب لاہور	

مصنف	کتاب	ناشر	سن
رشید حسن خان (م)	غالب فکروفن	غالب اکیڈمی کراچی	1987
رشید حسن خان (م)	انشائے غالب	مکتبہ جامعہ دہلی	1994
رشید حسن خان (م)	اشاریہ کلام غالب	دہلی یونیورسٹی	1970
رشید حسن خاں	املائے غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2002
رضیہ سجاد ظہیر	غالب آئینہ ادب	لاہور	سن ندارد
رفیع الدین راز	بر بساط غالب		
رفیع الدین بلخی سید	تجزیہ کلام غالب	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی	1995
رفیعہ سلطانہ	دود چراغ محفل (ڈراما)	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	سن ندارد
رفیق خاور	ابر گہر بار۔(منظوم اردو ترجمہ)	رائٹرز بیورو کراچی	1969
ریاض احمد پرواز	بفیض کلام غالب	نعت اکیڈمی فیصل آباد	2016
ریاض صدیقی	غالب برانہ مان	اسری پبلی کیشنز کراچی	1992
ریاض ندیم نیازی	جو آقا کا نقش قدم دیکھتے ہیں	ماورا پبلشرز لاہور	
زبیر رضوی	غالب اور فنون لطیفہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2004
زیڈ حسن ڈاکٹر	مرزا غالب اور جان کیٹس	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2021
ساجد صدیقی	مرزا غالب کے لطیفے	مکتبہ دین وادب لکھنؤ	1968
ساجد علی جے پوری اسدی	مخزن نعت مقبول	بزم احباب اسدی کراچی	1975
ساجدہ پروین	اشاریہ خطوط غالب	گورنمنٹ کالج لاہور	1993
سجاد احمد	غالبیات	فہیم اکیڈمی راجن پور	1990
سجاد باقر رضوی (م)	غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں	مجلس یادگار غالب لاہور	1969
سجاد مرزا	غالب نکتہ بیں	فروغ ادب اکیڈمی گوجرانوالہ	1994
سحر گاندربلی	پیغام بزم	قومی کونسل فروغ زبان اردو دہلی	2015
سحر انصاری	ذکر غالب ذکر عبدالحق	ادارہ یادگار غالب لاہور	1969

سعد مسعود غنی	غالب کے سوانح نگار	المضراب۔ملتان	2005
سعید الدین احمد قاضی	مطالبِ غالب	یونائیٹڈ پبلشرز۔لاہور	1952
سلطان صدیقی (م)	عرفان غالب	الحمرا اکیڈمی لاہور	1974
سلیم احمد (م)	غالب کون؟	المشرق۔کراچی	1971
سلیم اختر ڈاکٹر	غالب شناسی اور نیاز ونگار	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1998
سلیم اختر ڈاکٹر	شعور اور لاشعور کا شاعر غالب	فیروزسنز لاہور	1985
سلیمان اطہر جاوید	غالب کے چند نقاد	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1995
سلیمان اویسی	ہم طرح غالب	علمی کتاب خانہ لاہور	1969
سمیع اللہ قریشی ڈاکٹر	غالب کی نفسیات غم	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1992
سنجے گوڑ بولے	غالب پر تین یادگار تقریریں	اسباق پبلی کیشنز پونہ	2003
سہیل بخاری ڈاکٹر	غالب کے سات رنگ	آزاد بک ڈپو لاہور	1970
سہیل کاکوروی	ارضیات غالب	سہیل کاکوروی	سن ندارد
شاداں بلگرامی	شرح دیوان غالب	انجمن ترقی اردو۔ہند۔دہلی	1997
شاداں بلگرامی	روح المطالب	مظفر پرنٹرز لاہور	1967
شان الحق حقی	آئینۂ افکار غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2001
شاہد ماہلی	غالب اور آگرہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2003
شاہد ماہلی	غالب اور عہد غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2001
شاہد ماہلی	بیسویں صدی کا تخلیقی ذہن اور غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2009
شبیر احمد	غالب کے شہر میں	گلستان پبلی کیشنز کلکتہ	2005
شجاع ناموس ڈاکٹر	بزم فردوس	شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور	سن ندارد
شریف احمد عثمانی	ذکر غالب	مکتبہ معین الادب لاہور	1954
شریف الحسن	غالب کون؟	نگارشات۔لاہور	1988

شکیل الرحمٰن	مرزا غالب کا داستانی مزاج	ادارہ فروغ اردو لاہور	1987
شکیل الرحمٰن	مرزا غالب اور مغل جمالیات	ادارہ فروغ اردو لاہور	1987
شکیل پتافی ڈاکٹر	پاکستان میں غالب شناسی	بیکن بکس ملتان	2014
شمس الدین صدیقی	خیابان غالب	عظیم پبلشنگ ہاؤس۔ پشاور	سن ندارد
شمس الرحمٰن فاروقی	غالب کے چند پہلو	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	2001
شمس الرحمٰن فاروقی	غالب پر چار تحریریں	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2001
شمس الرحمٰن فاروقی	تفہیم غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2006
شمیم جہاں	اشاریہ غالب	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	1998
شمیم حنفی	مہا کوی غالب کی شاعری	ہوائی پرکاشن نئی دہلی	2002
شمیم حنفی	غالب کی تخلیقی حسیت	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2005
شمیم حنفی	غالب کے ایک سو پچاس سال	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	
شمیم طارق	غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857	غالب اکیڈمی دہلی	2008
شمیم طارق	غالب اور ہماری تحریک آزادی	ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی	2007
شنکر پرشاد جوش	نمونہ مغلوبیت غالب	مطبع صدیقی بھوپال	سن ندارد
شہا بلند شہری	مطالب الغالب	شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور	1951
شہباز علی میاں (م)	روداد دستنبو غالب	بک کارنر جہلم	
شہید صفی پوری	غالب کی تخلیقی تخیل	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	1969
شوکت تھانوی	غالب کے ڈرامے	ادارہ فروغ اردو لاہور	1951
شوکت سبزواری ڈاکٹر	فلسفہ کلام غالب	قومی کتب خانہ بریلی	سن ندارد
شوکت سبزواری ڈاکٹر	غالب فکر و فن	مجلس ترقی اردو پاکستان	1961
شیما مجید (م)	گفتہ غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2003
صابر آفاقی ڈاکٹر	نقش ہائے رنگ رنگ (فارسی قصائد کا ترجمہ)	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	2004

صارم الازہری	مقام غالب	ادارہ علمیہ لاہور	1968
صبا اکبرآبادی	ہم کلام (فارسی رباعیات کا اردو ترجمہ)	بختیار اکیڈمی کراچی	1982
صبا مرزا	اسداللہ خان غالب	گنج شکر پریس لاہور	2012
صباح الدین عبدالرحمٰن	غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد دوم	مطبع معارف۔اعظم گڑھ	1979
صباح الدین عبدالرحمٰن	غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد اول	دارالمصنفین۔اعظم گڑھ	1977
صبیح الدین رحمانی	غالب اور ثنائے خواجہ	نعت ریسرچ سنٹر کراچی	2009
صدیق الرحمٰن قدوائی	غالب کی تفہیم وتعبیر کے امکانات	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2009
صغیر النسا بیگم	غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1984
صفیر افراہیم	غالب باندہ اور دیوان محمد علی	براؤن بک پبلی کیشنز نئی دلی	2021
صوفی تبسم	روح غالب	گلوب پبلشرز لاہور	1969
ضیا اسلام پوری/حمید احمد خان	غالب اور تلمیحات غالب	میانوالی	1992
طالب کاشمیری	جوہر آئینہ	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1971
طالب کاشمیری	جائزہ کلام غالب	طالب پبلشنگ ہاؤس۔کشمیر	1980
طاہر تونسوی ڈاکٹر	غالب شناسی اور نخلستان ادب	مکتبہ الہام بہاول پور	2006
طاہر تونسوی ڈاکٹر	غالب شناسی اور الزبیر	اردو اکیڈمی بہاول پور	2006
طفیل دارا	رموز غالب	علمی کتاب گھر لاہور	1970
ظ۔انصاری	غالب شناسی	انٹرنیشنل ادب ٹرسٹ۔بمبئی	1965
ظفر ادیب	ہم عصروں پر غالب کا اثر	قصر اردو۔دہلی	1971
ظفر ادیب	کالی داس گپتا رضا بحیثیت ماہر غالب	دارالمصنفین۔اعظم گڑھ	1997
ظفر ادیب	غالب کے معنوی اساتذہ	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	1980
ظفر اقبال	غالب ادیبوں کی نظر میں	شاہین پبلشرز۔کشمیر	1988
ظفر اوگانوی	صفیر بلگرامی	نامعلوم	سن ندارد

ظفر الحسن مرزا	تماشائے اہل کرم	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
عابد رضا بیدار	غالبیات نو	رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز	1969
عابد گوندل	بھارت میں غالب شناسی	پیس پبلی کیشنز	
عارف بٹالوی	غالب کے رومان	الفلاح پبلی کیشنز لاہور	1969
عارف ثاقب ڈاکٹر	دیوان غالب نسخہ خواجہ تقابلی مطالعہ	اظہار سنز لاہور	2000
عارف شاہ گیلانی سید ڈاکٹر	شہنشاہ سخن	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	1970
عارف علی گیلانی سید	شہنشاہ سخن (فارسی کلام پر تنقید)	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	1970
عاصمہ اعجاز	غالب نامہ/ مطالعہ	یونیورسل بکس لاہور	1994
عاصی کرنالی	خوش مطالب شرح دیوان	جدید بک ڈپو لاہور	سن ندارد
عبادت بریلوی	غالب کا فن	ادارہ ادب وتنقید لاہور	1968
عبادت بریلوی	غالب اور مطالعہ غالب	سیکسینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی	1970
عبادت بریلوی	انتخاب خطوط غالب	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1997
عباس برمائی	غالب کے زمانے کی دلی	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	2006
عبدالحکیم خلیفہ	افکار غالب	مکتبہ معین الادب لاہور	1954
عبدالباری آسی	مکمل شرح دیوان غالب	مکتبہ شعر وادب لاہور	سن ندارد
عبدالباری آسی	مرزا غالب کی شوخیاں	مکتبہ دین وادب لکھنؤ	1965
عبدالحمید حکیم	مطالعات کلام غالب	غالب اکیڈمی نئی دہلی	2010
عبدالحمید حکیم	مطالعات خطوط غالب	غالب اکیڈمی دہلی	2009
عبدالرحمٰن بجنوری	محاسن کلام غالب	انجمن ترقی اردو۔ہند۔دہلی	1983
عبدالرحمٰن جمال الدین	اردوئے معلیٰ غالب فکر وفن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2015
عبدالرحمٰن طارق	صحیفہ ادب	لاہور	1935
عبدالرزاق جمالی	نگارشات غالب	تاج بک ڈپو لاہور	1952

عبدالرزاق محمد	انتخاب غالب	اقبال اکادمی پاکستان لاہور	1943
عبدالرشید علوی	دیوان غالب مع شرح	حق برادرز لاہور	1969
عبدالرشید فاضل	مہرنیم روز (اردو ترجمہ)	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	1969
عبدالرؤف عروج	بزم غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
عبدالستار قاضی	غالب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1986
عبداللطیف ڈاکٹر	غالب	جہانگیر بک ڈپو دہلی	1928
عبدالقوی دیسنوی (م)	قادر نامہ غالب	علوی پریس بھوپال	1971
عبدالقوی دیسنوی (م)	بھوپال اور غالب	شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال	1969
عبدالقیوم	دیوان غالب اور غالب کی غزل	غالب اکیڈمی کراچی	1987
عبداللہ سید ڈاکٹر	اطراف غالب	مکتبہ کارواں لاہور	1979
عبدالمغنی ڈاکٹر	غالب؟ کافن	انجمن ترقی اردو ہند	1997
عبدالمغنی ڈاکٹر	عظمت غالب	القمر انٹر پرائزرز۔لاہور	1993
عبدالودود قاضی	آثر غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2000
عبدالودود قاضی	کچھ غالب کے بارے میں	خدا بخش لائبریری پٹنہ	1955
عتیق صدیقی	غالب اور ابوالکلام	مکتبہ شاہراہ دہلی	1969
عرش ملسیانی	فیضان غالب	غالب اکیڈمی نئی دہلی	1977
عرش ملسیانی	دیدار غالب	مرکز تصنیف و تالیف نکودر	1974
عزیز یار جنگ	مومن و غالب	ادبی ٹرسٹ بک ڈپو حیدر آباد	سن ندارد
عشرت آرا سلطانہ	عصر حاضر میں غالب کی معنویت	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2015
عطا کوی	نذر غالب	عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ	1954
عظمت رباب ڈاکٹر	مطالعات غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	2014
عقیل احمد ڈاکٹر	جہات غالب	شاہد پبلی کیشنز لاہور	سن ندارد

علم الدین سالک	حیاتِ غالب	دین محمدی پریس لاہور	1910
علی مظہر رضوی	غالب نام آور	مجلس یادگار غالب حیدر آباد	1969
عنایت اللہ ملک	الہامات غالب	ایجوکیشنل پریس کراچی	1971
غضنفر علی	فرہنگ مرکبات غالب	ریسرچ سنٹر لکھنؤ	2012
غضنفر علی سید	شرح دیوان غالب	حاجی فرمان علی اینڈ سنز لاہور	1969
غضنفر علی غضنفر	دیون غالب مع شرح	حاجی فرمان علی اینڈ سنز لاہور	سن ندارد
غلام احمد فرقت کاکوروی	مزاحیہ شرح دیوان غالب	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	1964
غلام احمد فرقت کاکوروی	غالب خستہ کے بغیر	مکتبہ شاہراہ دہلی	1969
غلام جیلانی اصغر (م)	نذر غالب	سرگودھا اکیڈمی	1969
غلام حسین ذوالفقار ڈاکٹر	محاسن خطوط غالب	خیابان ادب۔ لاہور	1969
غلام حسین ذوالفقار ڈاکٹر	انتخاب مکاتیب غالب	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	2016
غلام حسین راز گجراتی	تذکرہ غالب اور غالب دپسند آم	گجرات	1973
غلام رسول مہر	نوائے سروش	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	1967
غلام رسول مہر	فرہنگ غالب	اردو لغت بورڈ کراچی	2019
غلام رسول مہر	غالبیات مہر	مجلس ترقی ادب لاہور	2015
غلام رسول مہر	غالب کے خطوط	کتاب منزل لاہور	سن ندارد
غلام رسول مہر	غالب	شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور	1944
غلام مصطفی تبسم صوفی	شرح غزلیات	فارسی پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور	1981
غلام مصطفی تبسم صوفی	روح غالب	گلوب پبلشرز لاہور	1969
غللام حسین ذوالفقار ڈاکٹر (م)	محاسن خطوط غالب	مکتبہ خیابان ادب لاہور	1969
فاطمہ حسن ڈاکٹر، رؤف پاریکھ	مطالعہ غالب کی چند جہتیں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	
فرح ذبیح	نادر ذخیرہ غالبیات	بہاالدین زکریا یونیورسٹی شعبہ اردو	2003

فرقت کاکوروی	مزاحیہ شرح دیوان غالب	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	1964
فرقت کاکوروی	غالبِ خستہ کے بغیر	مکتبہ شاہراہ دہلی	1970
فرمان فتح پوری	غالبیات نیاز فتح پوری	ادارہ یادگار غالب کراچی	2005
فرمان فتح پوری	غالب اور غالبیات	بیکن بکس ملتان	2005
فرمان فتح پوری	غالب شاعر امروز وفردا	اظہار سنز لاہور	1970
فرمان فتح پوری	غالب اور غالبیات	بیکن بکس ملتان	2005
فرمان فتح پوری	شرح ومتن غزلیات غالب	بیکن بکس ملتان	2000
فرمان فتح پوری	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب	حلقہ نیاز ونگار کراچی	1995
فرمان فتح پوری	تعبیرات غالب	ادارہ یادگار غالب؟ کراچی	1999
فرید عشرتی	بچوں کے غالب	لکھنؤ	سن ندارد
فوزیہ سحر ملک	ترتیب غالب	قرطاس۔فیصل آباد	2006
فیاض محمود سید (م)	تنقید غالب کے سو سال	مجلس یادگار غالب؟ لاہور	1969
فیاض نیازی	لطائف غیبی	خان اکیڈمی لاہور	1966
قاضی عبدالستار	غالب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1986
قدرت نقوی سید	نسخہ شیرانی اور دوسرے مقالات	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	1988
قدرت نقوی سید	غالب صد رنگ	ادارہ یادگار غالب؟ کراچی	2002
قدرت نقوی سید	غالب آگہی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	1992
قدرت نقوی سید	غالب کون ہے؟	امروز پرنٹنگ پریس ملتان	1969
قدرت نقوی سید	دیوان غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ جائزہ	مکتبہ تخلیق ادب کراچی	2000
قیوم نظامی (م)	غالب کی غزل پر تنقیدی مضامین	دارالادب لاہور	1967
کاظم علی خاں ڈاکٹر	توقیت غالب	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	1999
کالی داس گپتا	متعلقات غالب	ول پبلی کیشنز، ممبئی	1978

کالی داس گپتا	غالبیات کچھ مطالعے اور مشاہدے	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1998
کالی داس گپتا	غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1989
کالی داس گپتا	غالب کی بعض تصانیف	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	2002
کالی داس گپتا	غالب کی بعض تصانیف	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1990
کالی داس گپتا	غالب درون خانہ	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1989
کالی داس گپتا	غالب	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1998
کالی داس گپتا	دیوان غالب تاریخی ترتیب سے	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1988
کالی داس گپتا	تفہیم غالب کے دو حرف	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1999
کالی داس گپتا	بالک مندبے صبر	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1992
کالی داس گپتا	اسداللہ خان غالب مرد	ساکار پبلشرز۔ بمبئی	1991
کرار حسین، پروفیسر	غالب۔ سب اچھا کہیں جسے	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
کلیم احسان بٹ	غالب سرائی	رنگ ادب، کراچی	2023
کلیم سہسرامی ڈاکٹر	بنگال میں غالب شناسی	برقی آرٹ پریس ڈھاکا	1990
کمال احمد صدیقی	غالب کی شناخت	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1997
کوثر چاند پوری	جہان غالب	مکتبہ کائنات لاہور	1922
کوثر چاند پوری	جہان غالب	حامد برادرز۔ لاہور	1963
گلزار	مرزا غالب	قومی کونسل فروغ زبان اردو دہلی	2005
گلزار احمد بریگیڈیر	فغان غالب	چکوال	1995
گوپی چند نارنگ	غالب۔ معنی آفرینی	ساہتیہ اکادمی دہلی	2013
گوہر نوشاہی ڈاکٹر	مطالعہ غالب	مکتبہ عالیہ لاہور	1991
گوہر نوشاہی ڈاکٹر	غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	1997
گیان چند	رموز غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	1999

گیان چند	تفسیر غالب	آرٹ اینڈ کلچر سری نگر کشمیر	1971
گیان چند ڈاکٹر	غالب شناس مالک رام	ادارہ یادگار غالب کراچی	2002
لطیف الرحمٰن سید	غالب اور ان کے معترضین	غالب اکیڈمی دہلی	1973
لطیف الزماں خان	مکتوبات غالب (اردو ترجمہ)	دانیال۔کراچی	1995
لطیف اللہ پروفیسر	غالب شخصیت و کردار	ادارہ یادگار غالب کراچی	1998
مالک رام	گفتار غالب	مکتبہ جامعہ۔دہلی	1985
مالک رام	فسانہ غالب	فروغ زبان اردو۔نئی دہلی	2011
مالک رام	عیارِ غالب	غالب اکیڈمی دہلی	1969
مالک رام	ذکرِ غالب	مکتبہ جامعہ۔دہلی	1950
مالک رام	تلامذہ غالب	انجمن ترقی اردو۔ہند۔دہلی	1957
ماہر آروی	آبِ بقا/ غالب کی غزلوں پر غزلیں	حلقہ احباب۔آرا	1973
مجنوں گورکھ پوری	غالب شخص اور شاعر	مکتبہ ارباب قلم کراچی	1974
محبوب الرحمٰن فاروقی	سفینہ غالب	پبلی کیشنز ڈویژن۔دہلی	1997
محسن بن شبیر	یوسف ہندی قید فرنگ میں	مشین پریس حیدر آباد	سن ندارد
محمد اکرام شیخ	غالب نامہ	تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور	1939
محمد اکرام شیخ	حیاتِ غالب	فیروز سنز لاہور	سن ندارد
محمد اکرام شیخ	حکیم فرزانہ	فیروز سنز لاہور	1957
محمد الیاس ناصر دہلوی	شرح دیوان غالب	ندارد	2003
محمد انصار اللہ	غالب کی ببلو گرافی	علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ	1973
محمد انصار اللہ	غالب ببلو گرافی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1998
محمد ایوب شاہد	شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	1988
محمد ایوب قادری	غالب اور عصرِ غالب	غضنفر اکیڈمی کراچی	1995

محمد بشیر مرزا	سرگزشت غالب	پائز پریس کراچی	سن ندارد
محمد حسن	آسان غالب	ہندوستانی پراجیکٹ نئی دہلی	1994
محمد حسن	غالب ماضی حال اور مستقبل	خدابخش لائبریری پٹنہ	2005
محمد حسن میرٹھی	لطائف غالب	نامی پریس میرٹھ	1904
محمد حسین آزاد مولانا	آب حیات میں ترجمہ غالب/کالی داس گپتا	ول پبلی کیشنز، ممبئی	1987
محمد حیات خاں سیال	احوال ونقد غالب	نذر سنز لاہور	1967
محمد خاں	کلام غالب کے انگریزی ترجمے	ہمدرد پریس بنگلور	سن ندارد
محمد خان اشرف/عظمت رباب	فرہنگ اردو کلیات غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	2022
محمد سیادت نقوی	گفتہ غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1994
محمد شرف الدین ساحل	بیان میرٹھی اور غالب	علیم پرنٹرز ناگ پور	1997
محمد شفیع الدین نیر	غالب کی کہانی	نیر کتاب گھر دہلی	1969
محمد شکیل اختر ڈاکٹر	غالب بصد انداز	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2018
محمد صادق مہر	معارف غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	2022
محمد عاشق میجر	غالب۔ پی ٹی کورس پر	عارف پبلی کیشنز لاہور	1967
محمد عبدالرزاق شاہد	انتخاب غالب	اقبال اکادمی پاکستان لاہور	سن ندارد
محمد عبدالعلی	وثوق صراحت (شرح اردو دیوان)	مطبع فخر نظامی حیدرآباد دکن	1311ھ
محمد عبدالواحد واجد	شرح دیوان اردو غالب	مطبع فخر نظامی حیدرآباد دکن	1902
محمد عرفان	طرزِ غالب	مکتبہ دین وادب لکھنؤ	1972
محمد عزیز حسن	تصورات غالب	غالب اکیڈمی نئی دہلی	1987
محمد عسکری مرزا	مرزا غالب کی شاعری	صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ	1944
محمد عسکری مرزا	ادبی خطوط غالب	نظامی پریس لکھنؤ	1969
محمد علی صدیقی ڈاکٹر	غالب ؟ اور آج کا شعور	ادارہ یادگار غالب کراچی	2004

محمد علی فرجاد	احوال و آثار مرزا اسداللہ خاں غالب	مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان	1977
محمد عمر مہاجر	پنج آہنگ (ترجمہ فارسی خطوط)	ادارہ یادگار غالب کراچی	1969
محمد عنایت اللہ ملک	الہامات غالب	مرکنٹائل پریس لاہور	سن ندارد
محمد مصطفیٰ صابری سید	غالب اور تصوف	دارالاشاعت اسلامیہ کلکتہ	1977
محمد مہدی	غالب کون ہے؟	قومی کونسل فروغ زبان اردو دہلی	2013
محمد موسی خان کلیم	مقام غالب	نقوش پریس لاہور	1965
محمد ضیاالدین انصاری ڈاکٹر	تفتہ اور غالب	غالب اکیڈمی دہلی	1982
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سرگزشت غالب	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	1939
محی الدین قادری زور ڈاکٹر	روح غالب	مشین پریس حیدرآباد	1939
مختار الدین احمد آرزو	نقد غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1995
مختار الدین احمد آرزو	احوال غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1990
مخمور سعیدی	دستنبو (اردو ترجمہ)	غالب اکیڈمی کراچی	1969
مخمور سعیدی	اٹھارہ سو ستاون کی کہانی مرزا غالب کی زبانی	نیشنل بک ٹرسٹ۔نئی دہلی	2007
مسعود حسن رضوی ادیب	غالب تب اور اب	مقبول اکیڈمی لاہور	1991
مسعود حسن رضوی ادیب	شرح طباطبائی اور تنقید غالب	کتاب نگر لکھنؤ	1973
مسلم ضیائی	غالب کا منسوخ دیوان	مرزا اطفر الحسن	1969
مشتاق احمد دہلوی	غالب و درد کی دلی	اراکین مجلس ادبیات عالیہ	2020
مشرف انصاری	انتخاب غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1969
مشفق خواجہ	غالب اور صفیر بلگرامی	عصری مطبوعات کراچی	1981
مشکور حسین یاد	غالب کی طبع نکتہ جو	کلاسیک لاہور	2002
مشکور حسین یاد	غالب کا ذوق الہیات	ذوالفقار علی شیخ لاہور	1999
مشکور حسین یاد	غالب کا جمالیاتی شعور	اردو سائنس بورڈ لاہور	2007

مشکور حسین یاد	غالب بوطیقا	الحمد پبلی کیشنز لاہور	1998
مشیر احمد	خطوط غالب کے ادبی مباحث	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	2011
مضطر مجاز	نقش ہائے رنگ رنگ (فارسی کلام کا ترجمہ)	مکتبہ شعر و حکمت۔حیدرآباد	2004
مطلوب الحسن سید	منتخب کلام غالب انگریزی ترجمہ	الوقار پبلی کیشنز لاہور	2000
مظفر احمد	غالب۔غالب	مکتبہ زکریا ڈیرہ غازی خان	2001
معراج نیر/اصغر ندیم سید	دیوان غالب نسخہ خواجہ تجزیہ و تحسین	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1999
معین الدین عقیل	نادرات غالب لائبریری	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	2014
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	نقوش غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1995
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	لطائف غیبی	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1995
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	غالب کا علمی سرمایہ	یونیورسل بکس لاہور	1989
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	غالب پیائی	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1998
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	غالب اور انقلاب ستاون	الفیصل۔لاہور	1969
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	دیوان غالب نسخہ خواجہ اصل صورت حال	الوقار پبلی کیشنز لاہور	2000
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	دیوان غالب نسخہ خواجہ	گورا پبلشرز لاہور	1995
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	جاگیر غالب	مکتبہ کارواں لاہور	1994
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	تحقیق نامہ غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1998
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	تحقیق غالب	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1981
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	تحقیق غالب	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1981
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	بازیافت غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	1999
معین الرحمٰن ڈاکٹر سید	اشاریہ غالب	مجلس یادگار غالب لاہور	1969
مقبول حسین احمد پوری	گفتہ غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2003
مقصود حسنی	لفظیات غالب کا تحقیقی و ساختیاتی مطالعہ	ابوزر برقی کتاب خانہ	2017

مقصود حسنی	لسانیات غالب	قصور	1994
ممتاز حسن	جہات غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی	2000
ممتاز حسین پروفیسر (م)	غالب ایک مطالعہ	انجمن ترقی اردو کراچی	1969
منجو قمر	مرزا غالب اردو ڈراما	نگاہ پبلی کیشنز حیدر آباد	1969
منظر عارفی	آپ اسرار ازل	رنگ ادب، کراچی	
منظور احسن عباسی	مراد غالب	سید سنز پرنٹرز۔لاہور	1975
منظور اعجاز ڈاکٹر	انداز بیاں اور غالب	کتاب ترنجن	
منظور الامین	مرزا غالب کا سفر نامہ فرنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2015
منظور عثمانی	غالب کے گھر شادی	مکتبہ آتش۔دہلی	1220
مہ وش طیب	غالب نستعلیق لاہور		
مہدی حسن سید	روح غالب	افضل برقی پریس حیدر آباد	1950
مہدی نظمی	غالب	ہندوستان پبلی کیشنز غازی آباد	1987
موسیٰ خاں حکیم	مقام غالب	نقوش پریس لاہور	
نادم سیتاپوری	غالب نام آورم	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1970
نادم سیتاپوری	غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	1970
نادم سیتاپوری	خیابان غالب	مدینہ پبلشنگ کمپنی لاہور	1970
ناصر الدین ناصر	دبستان غالب	مکتبہ الفتح لاہور	1969
ناصر دہلوی	شرح دیوان غالب	شاہد پرنٹنگ سروس کراچی	2003
ناصر عابدی	سرگزشت غالب	الکتاب۔کراچی	1965
نام ندارد	غالب اور اس کا عہد (تصاویر)	صد سالہ یادگار غالب کمیٹی دلی	سن ندارد
نائلہ انجم	رسالہ نقوش میں ذخیرہ	غالبیات الفیصل۔لاہور	1989
نبی احمد باجوہ	شش جہات غالب (فارسی کلام کا اردو ترجمہ)	اسلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور	1972

نبیلہ ازہر	کلام غالب کا لسانی واسلوبیاتی مطالعہ	مجلس ترقی ادب لاہور	
نتالیا پری کارنیا/اسامہ فاروقی	غالب	مکتبہ دانیال کراچی	1998
نثار احمد فاروقی	غالب کی آپ بیتی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1997
نثار احمد فاروقی	تلاش غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1999
نجیب جمال ڈاکٹر	ماہ وسال عندلیب	سطور پبلی کیشنز ملتان	1997
نجیب جمال ڈاکٹر	غالب شکن یگانہ	کاروان ادب ملتان	1990
نذیر احمد خاں پروفیسر	نقد قاطع برہان	نامعلوم	سن ندارد
نذیر احمد خاں پروفیسر	محاسن الفاظ غالب	کتابیات لاہور	1969
نذیر احمد خاں پروفیسر	غالب کی مکتوب نگاری	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2003
نذیر احمد خاں پروفیسر	غالب پر چند مقالے	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1991
نذیر احمد خاں پروفیسر	غالب پر چند تحقیقی مطالعے	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	1996
نذیر علی شاہ	آیات غالب	بہاول پور	1968
نذیر محمد خاں	غالب	مکتبہ دانیال کراچی	1985
نریش کمار شاد	غالب اور اس کی شاعری	اسٹار پبلی کیشنز دہلی	سن ندارد
نریش کمار شاد	انداز غالب	مشورہ بک ڈپو دہلی	سن ندارد
نشتر جالندھری	روح غالب	تاج بک ڈپو لاہور	1954
نظامی بدایونی	نکاتِ غالب	نظامی بک ایجنسی انڈیا	1959
نظم طباطبائی	شرح دیوان اردو غالب	مکتبہ جامعہ۔دہلی	2012
نظیر حسنین زیدی	غالب تاریخ کے آئینے میں	مسعود اکیڈمی کراچی	1963
نظیر صدیقی پروفیسر	غالب اور اقبال	روحانی پرنٹرز اسلام آباد	2000
نواز صدیقی پروفیسر	غالبِ خستہ کے بغیر	مثال پبلشرز۔فیصل آباد	
نور الحسن نقوی	غالب شاعر و مکتوب نگار	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	2000

نوشاد منظر	غالب ہندی ادیبوں کے درمیاں	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	
نیاز فتح پوری	مشکلاتِ غالب	دارالشعور لاہور	1998
نیاز فتح پوری	غالب فن اور شخصیت	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1987
نیر پرویز	کائنات غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	2003
نیر مسعود	تعبیر غالب	کتاب نگر لکھنؤ	1973
نیلوفر احمد	اردو میں خط نگاری کی ادبی روایت اور غالب	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	2007
ہاجر دہلوی	غالب اور ہاجر (غالب کی زمینوں میں)	دیال پرنٹنگ پریس دہلی	1972
ہاشم عظیم آبادی	عالم بالا سے غالب کے خطوط	ہاشم عظیم آبادی	1989
ہاشم عظیم آبادی	انداز بیاں اور (طرح میں مزاحیہ غزلیں)	بہار اردو اکیڈمی پٹنہ	1982
ہما اخلاق	اشاریہ خطوط غالب۔حصہ اول	شعبہ اردو۔گورنمنٹ کالج لاہور	1991
ہنس راج رہبر	غالب حقیقت کے آئینے میں	لاجپت رائے اینڈ سنز دہلی	1972
واجد سحری	غالب کی راہگیری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	1990
وارث کرمانی	غالب کی فارسی شاعری	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	2001
وجاہت علی سندیلوی	نشاط غالب	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	1964
وجاہت علی سندیلوی	باقیات غالب	نسیم بک ڈپو۔لکھنؤ	1960
وحید قریشی	نذر غالب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	1970
وزیر الحسن عابدی سید	باغ ودر (ترجمہ فارسی خطوط)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	1968
وزیر الحسن عابدی سید	افادات غالب	مجلس یادگار غالب لاہور	1969
وزیر آغا	غالب کا ذوق تماشا	اقبال اکادمی پاکستان لاہور	1997
وقار عظیم ڈاکٹر	وقار غالب	گورا پبلشرز لاہور	1997
وقار معین سید	برسبیل غالب	الوقار پبلی کیشنز لاہور	2000
یگانہ چنگیزی	غالب شکن	لکھنؤ	1935

یوسف بخاری دہلوی	سرودِ غالب	احمد علی شیخ	1968
یوسف حسین خان ڈاکٹر	غالب اور آہنگ غالب	کاروان ادب ملتان	سن ندارد
یوسف حسین خان ڈاکٹر	غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	نگارشات۔لاہور	1986
یوسف سلیم چشتی	شرح دیوانِ غالب	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	1959
یونس اگاسکر	غالب ایک بازدید	مرشیہ پبلی کیشنز دہلی	2017

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆